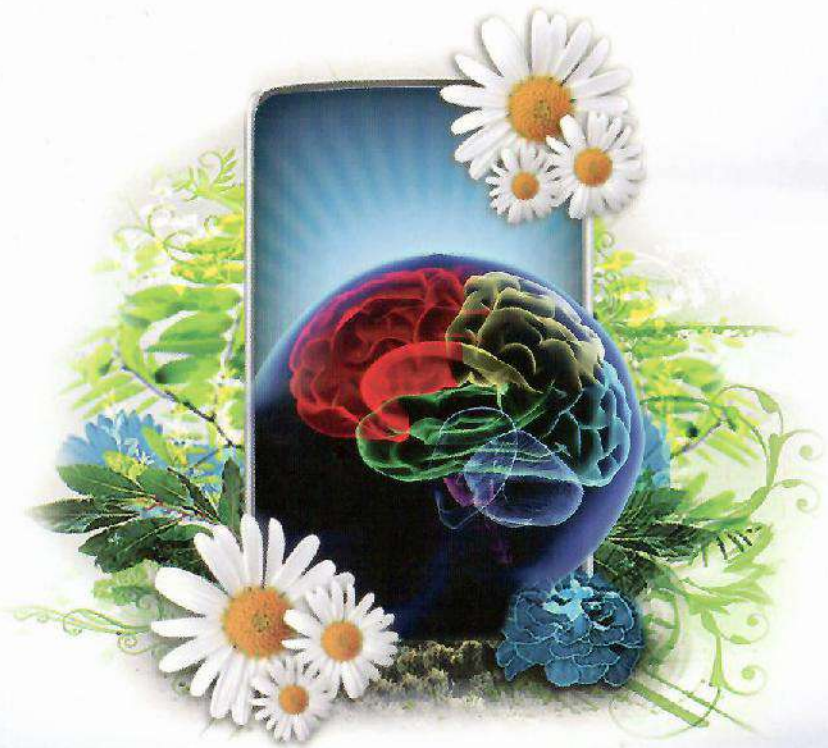


اصلاح النخيل



تأليف
حكيم الامت مولانا محمد اشرف علي تها فوى قدس سره

۱۳۶۲ - ۱۳۸۰
۱۹۴۳ - ۱۸۶۳



مكتبة ابي بكر كوشل برس ميديا

69

اصلاح النجس

تأليف

حكيم الامت مولانا محمد اشرف علي تھانوی قدس سرہ

۱۲۸۰ - ۱۳۶۲ھ

۱۸۶۳ - ۱۹۴۳ء



ڈائریکٹر ایجوکیشن گورنمنٹ ہند

تمہید

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بعد الحمد والصلوة!

واضح ہو کہ ایک شخص نے اپنے ایک عزیز کو در باب اتباع شریعت و درستی اعمال و وضع کے نصیحت کے طور پر لکھا تھا، خیالات جدیدہ کے غلبے سے اس نصیحت میں کچھ شبہات و اوہام اس عزیز کی طبیعت میں پیدا ہوئے، جس کی اطلاع اس شخص کو کی گئی، اس شخص نے اس کے جواب لکھے، چوں کہ ایسے شبہات اکثر لوگوں کو پیدا ہوتے ہیں، اس لیے فائدہ عامہ کے واسطے مصلحت معلوم ہوا کہ وہ شبہات اور ان کے جوابات ایک جامع کر کے مجموعے کا نام ”اصلاح الخيال“ رکھ دیا جاوے۔ اور ایک زمانے میں ایک شخص کامل نے ایک خط نصیحت آمیز بعض معززین قریب خیالات جدیدہ کو تحریر فرمایا تھا، جس کے بھیجنے کی نوبت نہیں آئی تھی، اس کی نقل بعض لوگوں کے پاس تھی، اس کے مضامین بھی اس مجموعے کے مناسب تھے، اس لیے اس کا بھی الحاق کر دینا آخر میں مناسب معلوم ہوا۔ فقط

والسلام

العبد الضعیف

محمد اشرف علی عنفی عنہ

تقریرِ شبہات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تقریرِ شبہ اول: میرے خیال میں جس نگاہ سے شریعت اور اتباعِ شریعت کو ہندوستان میں علمائے دین دیکھتے ہیں وہ شرائطِ اسلام نہیں ہیں، زمانے کی رفتار نے اور اللہ کی مشیت نے ملک پر انگریزوں کو حکمران کر دیا، جس وقت مسلمانوں کی اول سلطنت قائم ہوئی تھی اس وقت کی تواریخ نکال کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ قبل از بعثت جو حالت مسلمانوں کی تھی اس سے بدتر حال دیگر اقوام کا تھا، مثلاً: انگلستان میں مقدمات کی تحقیقات میں ثبوتِ جرم کے لیے گرم کھولتے ہوئے پانی میں مجرم کے ہاتھ ڈالے جاتے تھے، اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اگر اس کے ہاتھ نہ جلے تو وہ ضرور بے گناہ ہے، سزا میں یہ سزا دی جاتی تھی کہ زندہ آدمی کو جلا دیتے تھے، بہر صورت! موازنہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قوم عرب زمانے کی رفتار کے موافق کوئی پس ماندہ قوم نہ تھی، بلکہ اس زمانے کی مساوی قوموں کی یہی بہتر حالت میں اسلام نے ان کی اصلاح کی، ان کے اخلاق درست کیے، توحید سکھائی، اور یہ ایک نئی قوم عرصہ روزگار میں برآمد ہوئی، اور شمشیر بکف جس طرف نکل کھڑی ہوئی فتحِ ملکی ان کے آگے آگے ہوتی گئی، یہاں تک کہ براعظمِ ایشیا اور یورپ کے بڑے حصے کو فتح کر ڈالا، فتح و نصرتِ ملکی میں تائیدِ من جانب اللہ قرآن اور حدیث سے ثابت ہے، اس لیے اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جس قوم میں صلاحیت اور اتباعِ احکامِ خداوندی پایا جاتا ہے اس پر اللہ کی مدد ہوتی ہے۔

چنانچہ مسلمانوں نے فتح کر کے جو سلطنتِ عظیم قائم کی اس کی مثال تاریخ میں نہیں ہے، بعد زمانہ خلفائے راشدین کے باہم وہ نزاع شروع ہوئے، اور مسلمانوں ہی کے ہاتھ سے وہ شرمناک واقعہ کر بلا سر زد ہوا جس کی وجہ سے قیامت تک مسلمانوں کو ندامت رہے گی، زوالِ سلطنت کے آثار شروع ہو گئے۔ لیکن چونکہ کوئی قوم سربر آوردہ اور تعلیم یافتہ صفیہ ہستی پر موجود نہ تھی، اس لیے مسلمانوں کو اس حصہ ملک میں جہاں ان کی سلطنت قائم ہو چکی تھی امن

نصیب رہا، فتوحات ملکی بند تھیں اور حدودِ سلطنت قائم ہو گئی۔ لیکن روز بروز آثارِ روایت ظاہر تھے، یعنی ملک میں امن قائم رکھنے اور دوسری قوموں کے حملوں سے بچنے کی کوئی تدبیر مسلمانوں نے نہیں کی، ملک میں جو جو ظلم ایک ادنیٰ زمین دار اپنی رعایا پر کر سکتا تھا اس کی مثالیں غدر سے پہلے تک پائی جاتی تھیں۔

یہاں تک دسویں صدی کے قریب اہل یورپ نے ترقی کرتے کرتے مصالحوہِ حرب یعنی باروت وغیرہ دریافت کی، اور مسلمان بادشاہوں کی شامت آئی، جس زمانے کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے اس کو ابتدائے زمانہ قرار دے کر مسلمانوں کی حالت کا اندازہ دیگر اقوام سے کیا جاوے تو معلوم ہوگا کہ ابتدائے اسلام میں مسلمان خوش اخلاق، جری، ہمت والے تھے، دوسری قوموں میں بزدل، آرام طلب، کم ہمت تھے، مسلمان جہاں تھے وہیں رہے، بلکہ آگے چل کر اس سے بھی گرتے گئے، اور دوسری قومیں ترقی کرتی گئیں، یہاں تک کہ روم کولڑتے لڑتے پریشان کر دیا، اور اگر سلطان عبدالحمید خان اس رنگ میں نہ رنگ جاتے جو اس وقت سلاطین یورپ کا ہے تو بقائے سلطنت ناممکن تھی، اگر سلطان روم ہندوستان کا اسلام اپنے یہاں قائم کریں تو کسی کو ان کی طرف توجہ کرنے کی بھی ضرورت نہ پڑے، خود بخود ان کی زوال سلطنت کے لیے کافی ہو جاوے، انھوں نے زمانے کی ضرورت کے موافق فوج میں وہ وہ سامان کیے ہیں جن کو ہندوستان کے علما کبھی جائز نہیں کہہ سکتے، اور آپ سے سچ کہتا ہوں کہ اگر سلطان اس بات کا وعدہ کر لیتے کہ میں علمائے ہند کے احکام کی تعمیل کروں گا، اور پھر یہاں سے چند علما ان کا طرز تمدن درست کرنے کے لیے جاویں، اور وہ اپنے وعدے کے موافق اس پر عمل کریں تو اور تو میں کہہ نہیں سکتا، مگر سلطنت قائم نہ رہے۔

اب اگر یہ کہا جاوے کہ بلا سے سلطنت قائم نہ رہے اتباعِ شریعت بڑی چیز ہے، اور عاقبت کی درستی ہو جاوے، سلطنت رہے یا نہ رہے تو ایسا جینا پراگندہ روزی پراگندہ دل کا کیا نفع ہے۔ دوسرے یہ کہ نتیجہ بس یہ نکلے گا کہ اسلام ہم کو حکومت اور سلطنت نہیں سکھلاتا ہے، بلکہ ذلت اور در یوزہ گری تعلیم کرتا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے، پہلے مسلمانوں کی مثال اس

وقت بالکل فضول ہے، کیوں کہ وہ رنگ زمانہ کا نہیں، اگر آج سلطانِ روم حضرت عمرؓ کا سا طریقہ اختیار کریں، یعنی بیت المال کا اونٹ تلاش کرنے خود چل دیں تو آپ دانا ہیں، ذرا اندازہ کیجیے کہ سلطنت کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اور ہرگز نہیں، یہ اُس زمانے کے شایاں تھا کہ خود خلیفہ راتوں کو رعایا کی خبر لیتے پھرتے تھے، اور چوروں کو کول مزدوری پر پہنچا دیا کرتے تھے۔

دوسرے شبے کی تقریر: یہ وہ وقت ہے کہ ملک علم کے زور سے قائم ہے، شمشیر کے زور سے نہیں، ایک شخص دلاور شمشیر بکف نہایت جرأت کے ساتھ میدان میں آتا ہے، لیکن ایک ہزار قدم سے ٹھنڈا کر دیا جاتا ہے، اور جس چیز سے ٹھنڈا کر دیا جاتا ہے اس میں ایک ذرا سی دور کے اندر اس قدر گولیاں علم کے زور سے بھردی ہیں کہ ایک منٹ میں بیس فیر کرے، کہاں تک خالی جائیں گے۔

تیسرے شبے کی تقریر: افسوس کہ مسلمانوں نے اللہ کی پیدا کی ہوئی نعمتوں کی قدر نہ کی، پانی سے وہ کام نہ لیا جس کی وہ شایاں تھا، بس پیاس میں پی لیا، وضو کیا، غسل کیا، طہارت کی، اب وہی پانی ہے کہ جس سے بھاپ پیدا ہوتی ہے، اور جو کام ایک ہزار آدمیوں کی قوت سے نہیں ہو سکتا اس کو ایک آدمی کرتا ہے۔

چوتھے شبے کی تقریر: بھلا اس میں کون بات خلاف شریعت ہے؟ جو کبھی مسلمانوں نے اس کی طرف توجہ نہ کی، یا اب دوسروں کو دیکھ کر نہیں کرتے۔ یہ ایک ادنیٰ سی مثال میں دیتا ہوں۔ اس طرح دنیا میں ایک ایک چیز کی بابت اس وقت کوئی ہوتو ایک ایک دفتر لکھ ڈالے، وہ کون سی چیز ہے کہ مسلمانوں نے استعمال نہیں کی، اور جس کا استعمال انھوں نے اپنے جسم فانی تک محدود نہیں رکھا، اپنے ابنائے جنس کو نفع پہنچانے کے لیے اس پر ذرا بھی غور نہیں کیا، یہ بات مسلمہ ہے کہ قیامت کے دن ذرا ذرا چیز سے حساب لیا جاوے گا۔ میرا تو قریب قریب یہ عقیدہ ہے کہ جس شخص نے ایسی بے ترتیبی کے ساتھ اللہ کی نعمتوں کو استعمال کیا وہ ضرور مستوجبِ جواب دہی ہے۔

پانچویں شبے کی تقریر: اس وقت کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کس چیز کو شرطِ اسلام قرار دیا جاتا ہے؟

چھٹے شبے کی تقریر: جس چیز کی طرف مسلمانوں کو بلایا جاتا ہے وہ اس سے اتنی دور نکل گئے

ہیں کہ ان کے کان میں اس کی آواز بھی نہیں جاتی، میں تو پردیس رہ کر اس تماشہ کو دیکھ رہا ہوں۔
ساتویں شبے کی تقریر: جو باتیں ہمارے علمائے دین و پیشوایان مذہب تعلیم کرتے ہیں ان میں زمانہ موجود کے موافق ذلت اور خواری کے سوائے یہاں تو کچھ نظر نہیں آتا، عاقبت میں اگر بہشت اور حوریں ملیں تو اللہ سے امید رکھیں۔ لیکن اس سے یہ لازم آتا ہے کہ دنیا میں نکتہ کے ساتھ بسر کرنا عاقبت کی درستی کو لازم ہے، اگر فی الواقع ایسا ہے تو صاف الفاظ میں یہی کہنا چاہیے، خواہ خواہ یوں کہا جاتا ہے کہ بقدر ضرورت دنیا بھی حاصل کرو۔

آٹھویں شبے کی تقریر: ہم کہتے ہیں کہ بقدر ضرورت بھی دنیا حاصل نہیں ہوتی اس طریقے سے جو ہم کو اس وقت علمائے دین تعلیم کرتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص کو کتابیں پڑھا کر عالم بنایا، آپ خود متفکر ہیں کہ وہ اب کیا کرے، پچھلی مرتبہ یہ رائے تھی کہ ان کو حرفت سکھلائی جاوے تو وہ بھی کیا، بڑھی کا کام یا لوہار کا کام۔ اب میں نہایت ادب سے گزارش کرتا ہوں کہ بڑھی کا کام اور لوہار کا کام سکھلانے، اور تار برقی اور ریل کے ہانکنے کا کام یا اسٹیم بنانے کی ترکیب سکھانے میں شرعاً کیا فرق ہے؟ تو اتنا کہ خود مولوی صاحب نہیں جانتے دوسرے کو کیا سکھلا دیں گے؟ لیکن لوہار، بڑھی کا کام سکھلانے کے لیے بھی تو ان کو لوہار، بڑھی نوکر رکھنے پڑیں گے، تو پھر دوسرے فنون سکھلانے والے کیوں نہ نوکر رکھے جاویں؟ مگر بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر کوتاہ اندیشی اور پست حوصلگی اس قدر آگئی ہے کہ ان کی نگاہ ہی اوپر نہیں جاتی۔

نویں شبے کی تقریر: میری تو اب یہاں تک شامت آگئی ہے کہ میں ان مدارس عربیہ پر اعتراض کرتا ہوں، اور ان کو بہ حیثیت موجودہ کار خیر نہیں سمجھتا، اور اس کے ساتھ الحمد للہ کہ مسلمان ہوں، اور اپنے اللہ سے قوی امید ہے کہ مجھ کو مسلمان رکھیں گے۔

اب سنیہ کہ میں مدارس عربیہ پر کیا اعتراض رکھتا ہوں، قرآن کے احکام کے موافق آپ کے اوپر پہلے اپنے اقارب، پھر پڑوسی، پھر شہر والے، پھر ملک والے، پھر ابن السبیل کے حقوق ہیں، اب آپ ان مدارس کو دیکھیں کہ ان سے کس کو نفع پہنچتا ہے، ہمارا یہ کام نہیں کہ جو آیا اس کو پڑھا دیا، بلکہ یہ کام ہے کہ وہ مفید طرز اختیار کریں جس سے ہمارے بھائیوں کو نفع پہنچے۔

مجھے ایک صاحب ملنے آئے جو علما کے بڑے معتقد ہیں اور ہمیشہ علما کی خدمت میں حاضر رہتے ہیں اور بڑی خدمت کرتے ہیں، میرا خیال ان کے طرز سے یہ ہے کہ انھوں نے زیارتِ علما کو اپنے روزمرہ میں داخل کر رکھا ہے، میں نے ان سے سوال کیا کہ وضو میں کے فرض اور کے سنت ہیں؟ حالاں کہ انھوں نے تسلیم کیا کہ وہ ستائیس برس سے نماز پڑھتے ہیں، لیکن بے چارے اس کا جواب نہ دے سکے، تو میں نے ان سے پوچھا کہ آپ صہنے میں ایک آدھ مرتبہ تو کسی مولوی سے ملتے ہوں گے، انھوں نے کہا کہ جناب میں تو روزانہ حاضر ہوتا ہوں، تو میں نے پوچھا کہ بھلا تم کو کسی نے یہ بتلایا کہ وضو میں کے فرض اور کے سنت ہوتے ہیں؟ اگر کہیں سفر میں ہو اور صرف پاؤ بھر پانی ملے تو وضو کیسے کرے؟ غرض میں نے ان کو بتلایا، اور چند مسائل اور بتلائے تو انھوں نے نہایت شکر گزاری کے ساتھ یہ تسلیم کیا کہ مجھ کو عالموں کی صحبت سے اتنا نفع نہیں ہوا جتنا آپ کی چند باتوں سے ہوا، میں اس مثال سے اپنی تعریف کرنا نہیں چاہتا، بلکہ علما کی حالت کا اظہار آپ پر کرتا ہوں کہ ان کی حالت قابلِ اصلاح ہے، اگر یہ درست ہوں گے تو ہم لوگ خود بخود ٹھیک ہو جاویں گے۔

دسویں شبے کی تقریر: نصابِ تعلیم پر آج سے دس برس پہلے کوئی اعتراض نہ تھا، اور بڑے بڑے عالم گذر گئے، کبھی آپ نے کسی کی زبان سے سنا کہ عربی کا نصابِ تعلیم ناقص ہے، اور اس میں اوقات ضائع ہوتے ہیں، یا مدارسِ عربیہ کے اندر لوہار، بڑھی کا کام سکھلانا ضرور ہے، یہ نئے علما جو اس وقت پیدا ہوئے ہیں، ان کو البتہ یہ بات سوچھی ہے۔ جناب من! علمائے موصوفین کے ہم عصر اگر کوئی موجود ہوں گے تو ان کو ان اعتراضات پر جو اس وقت کے علما، نصابِ دین پر کر رہے ہیں ویسا ہی اعتراض ہوگا جیسا کہ اس وقت کے علما کو کوٹ پتلون پہننے والوں پر ہے۔ یہ تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ خود علما میں کتنا انقلاب ہے۔

گیارہویں شبے کی تقریر: جن باتوں کو آج سے دس برس پہلے حرامِ مطلق بتلاتے تھے، اب اس کے جواز پر فتوے دیے جاتے ہیں، آخر یہ کیوں؟ زمانے کی حالت سے جوں جوں خبر ہوتی جاتی ہے کہتے جاتے ہیں۔

بارہویں شبے کی تقریر: مگر ہمارے علما نے گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے، اس لیے زمانے سے

جلد جلد خبردار نہیں ہوتے، اگر باہر پھریں، اور مسلمانوں کے بچوں کا حال دیکھیں، اور پھر اندازہ کریں کہ یہ کس حد پر پہنچ گئے ہیں، تو شاید کوئی طریقہ ان کی اصلاح کا سمجھ میں آ جاوے، لیکن سمجھ میں آوے گا اس قدر عرصے کے بعد کہ شاید پھر علاج کا موقعہ بھی نہ رہے۔

تیرہویں شبے کی تقریر: تعلیم علوم دین مبنی ہے تین چیزوں پر: اعتقادات، عبادات، معاملات، بلکہ آپ تو فرماتے ہیں کہ شرط اسلام یہی چیزیں ہیں، شاید تصوف وغیرہ دو چیزیں اور شامل کی ہیں، بہر صورت ان تین چیزوں کا نام ضرور اسلام ہے۔ اعتقادات کا کوئی نصاب نہیں، یہ قائم رہ سکتا ہے عبادات اور معاملات سے، اب رہے معاملات، بڑا حصہ ان کا لازم ہے سلطنت کو، جس کی سلطنت اس کے قانون کے موافق معاملات ہوں گے، اب آج کل کوئی زنا کرے تو سنگ سار نہیں کیا جاتا، چوری کرے تو ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے۔ اچھا! اب فرض کیجئے کہ کسی نے زنا کیا تو نالاش کرنے والا کیا کرے، آٹھ آنہ اسٹامپ پر عرضی دے۔ یہ طریقہ شریعت میں کہاں لکھا ہے؟ پھر حلف سے اپنا اظہار لکھاوے، حلف بھی کیا کہ جو گواہی میری رو برو عدالت میں ہوگی وہ بالکل سچ ہوگی، سوائے سچ کے جھوٹ نہ ہوگی، خدا میری مدد کرے، اس کے بعد شہادت پیش ہوئی، جس کے ساتھ زنا کیا وہ ڈاکٹر کے ملاحظے کے لیے بھیجی گئی، اگر سب طرح ثابت ہو گیا تو چار مہینے کی قید اور دو سو روپے جرمانہ، اور جرمانے میں سے ایک سو پچاس روپے بطور معاوضہ مدعی کو دیا جاوے۔

اب ذرا غور تو کیجئے کہ یہ معاملہ اول سے آخر تک کسی مرتبے میں بھی شریعت کے موافق ہوا؟ اور یہ جو ۱۵۰ ان حضرات کو ملے وہ کب جائز ہوئے؟ یا ایں ہمہ یہ روزمرہ ہو رہا ہے، اور شاید علما کو اس کی خبر بھی نہ ہو، یہ ایک ذرا سی مثال ہے، اس سے بڑھ کر معاملات ہو رہے ہیں تو اب جن طالب علموں کو یہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں کہ اس جرم کی سزا یہ ہے، اور اس کے یہ، وہ ان کے کس کام آویں گی جب کہ معاملات کا تصفیہ قوانین موجودہ کے مطابق ہوتا ہے۔ اب جس شخص نے مقدمہ زنا میں یہ حکم دیا وہ مصداق ہے: **﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ﴾** کا، لیکن کیا کسی کا خیال اس طرف منتقل ہوا ہے کہ جس شخص نے نالاش کی وہ بھی معین ہوا؟ کیوں کہ وہ تو جانتا تھا کہ شرع کے مطابق حکم نہ ہوگا، اب کہنا چاہیے کہ بے شک وہ بھی معین

ہوا، تو اب کیا علاج؟ علاج یہ کہ خاموش گھر میں بیٹھو۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر مسلمانوں کی حالت کو اندازہ کیجیے کہ یہ کیا کریں؟ انھیں تو اللہ میاں اس جہان سے اٹھالیں تو ان کی نجات ہو، غرض! بڑے معاملات تو حکومت کے ساتھ گئے۔

اب چھوٹے چھوٹے معاملات روزمرہ کے ان کے احکام اردو کی کتابوں میں موجود ہیں، جو بچوں کی تعلیم کے نصاب ابتدائی میں داخل ہیں، یا داخل کرنے چاہئیں، عبادات کا باب نہایت مختصر ہے، روزے کے احکام قرآن کے ایک رکوع میں ہیں، اسی طرح نماز کے احکام اردو کی ایک کتاب میں موجود ہیں، حج اور زکاۃ کی بڑے ہو کر ضرورت ہوتی ہے، اور ان کے مختصر احکام ہیں، اس مختصر کو اتنا طول دیا ہے کہ بچوں کے دس برس اس میں خرچ ہوتے ہیں، اور جب تیار ہو کر نکلتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ اب کیا کریں؟

چودھویں شبے کی تقریر: اگر کچھ تعلیم کی عمر باقی ہے، اور کچھ حمیت کا تقاضا بھی ہے تو جلدی سے طب پڑھ لی، اور معاش کا ایک ذریعہ نکال لیا، اور اگر کہیں عمر ہو چکی ہے، جیسا کہ کثرت سے واقع ہوتا ہے تو سیدھے مسجد کی راہ لی، اور جو کچھ پھر یہ لوگ کرتے ہیں آپ کو مجھ سے زیادہ تجربہ ہے، میں لکھنا کیا چاہتا تھا، اور لکھ گیا کیا۔

پندرہویں شبے کی تقریر: میں اپنا حال عرض کرنا چاہتا ہوں: میں کوٹ پتلون یا یوں کہیے کہ پورا انگریزی لباس پہنتا ہوں، سوائے ٹوپی کے کہ وہ ترکی ہے، اس ٹوپی کے اختلاف سے یہ لباس ہمارا قومی بن جاتا ہے، اور اگر اس بات کو کوئی اس وقت تسلیم نہ کرے تو دس برس بعد اس کو خود پہننا پڑے گا، میں اس بات کو ایسے وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ مجھ کو اس میں کچھ بھی دوسوہ نہیں۔ اب مجھ سے ارشاد ہوا کہ یہ لباس خلاف شریعت ہے، ترک کرنا چاہیے۔ تو مجھ کو یہ بھی بتلایا جاوے کہ کیا پہنوں؟ جو کام مجھ کو کرنا پڑتا ہے اور جو اللہ نے میری تقدیر میں لکھ دیا ہے اور جس کے کرنے پر قضا و قدر سے مجبور ہوں، وہ ایسا ہے کہ مجھ کو چار گھنٹے گھوڑے کی پیٹھ اور تین گھنٹے ہائیکل پر (اگر ہائیکل نہ ہو تو پھر دوسرے گھوڑے پر) شہر اور اطراف شہر میں پھرنا پڑتا ہے، اور یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ مجھ کو بیس میل کا یومیہ سفر ہو جاتا ہے۔ جو پائے جامہ، میں سواری میں پہنتا ہوں وہ اس کپڑے کا ہے جو ہاتھ سے نہیں پھٹ سکتا، تاہم اس قدر جلد گھس گیا کہ

جس پر مجھ کو خود تعجب ہے، ڈھیلے پائچے یا لٹھ کا شرعی پاجامہ ایک دن مشکل سے کام دے سکتا ہے، اس بات کا یقین آپ صرف اس صورت میں کر سکتے ہیں کہ آپ مجھ کو سچا آدمی خیال فرمائیں، ورنہ بلا تجربہ کے اس کا یقین ہونا مشکل ہے۔

پتلون اور پاجامہ میں جو فرق سواری کے اندر ہے وہ تجربے پر موقوف ہے، اس کا بیان کرنا مشکل ہے، پہلے لوگوں کا اگر حوالہ دیا جاوے تو میں نصابِ تعلیم کا حوالہ دوں گا، میرا لباس یوں نہیں تبدیل ہوگا، بلکہ اس کی ترکیب یہ ہے کہ کوئی شخص ایسا ہی کام کر کے دکھاوے، اور پاجامہ، انگا چونڈ، دوپٹہ پہنے، اور اگر وہ کامیاب ہو تو میں قسم کھاتا ہوں کہ فوراً لباس تبدیل کر دوں گا۔

عبادات میں روزہ میں رکھتا ہوں، زکاۃ دیتا ہوں، حج کا ارادہ ہے، اللہ تعالیٰ پورا کرنے والے ہیں، نماز جماعت کی تو کیا پابندی! وقت سے بھی ادا نہیں ہوتی۔ صبح کی نماز پہلے سے قضا پڑھتا ہوں، اور میں جانتا ہوں کہ برا کرتا ہوں، اور اس کی اصلاح کی میں کوشش کر رہا ہوں۔

سواہوں شبے کی تقریر: لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے پیغمبر خدا ﷺ نے تاکید وقت کی فرمائی ہے، لیکن امام شافعی صاحب نے جمع بین الصلواتین کا ایک خاص موقع پر فتویٰ دیا ہے۔ اور حضرت ابوداؤد صاحب نے صرف لوگوں کے حرج ہونے پر جمع صلاۃ کا ذکر کیا ہے۔

میں اخیر میں پھر اس قدر بیان کرتا ہوں کہ یہ عریضہ میں نے تین بجے رات کو لکھنا شروع کیا، اور اڑھائی گھنٹے میں ختم کیا، لیکن اس میں ایک لفظ بھی میرا آوردہ نہیں ہے، قلم سے یوں ہی نکلتا چلا گیا۔ میں اس کو پڑھ کر دیکھتا ہوں تو اس کا بھیجنا داخل گستاخی سمجھتا ہوں۔ لیکن صرف ایک خیال مجھ کو اس کے بھیجنے پر مجبور کرتا ہے، وہ یہ کہ طیب کے سامنے اپنا مرض بیان کرنا داخل گستاخی نہیں ہے، مثلاً: کسی شخص کے سامنے اپنے اعضائے نہانی کھولنا سخت بے جا ہے، لیکن اگر کسی کے کوئی پھوڑا ایسے مقام پر نکل آوے تو بلا تامل حکیم صاحب کو دکھلاتا ہے، اور اگر حکیم کو دکھلانے میں یہ شخص اتنا ہی تامل کرے جتنا کہ معمولی طور پر عام آدمیوں سے کرتا تھا، تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ زخم اندر ہی اندر سر کرنا سوز کر لے گا، اور اس شخص کی جان جاتی رہے گی۔

میرا عقیدہ اور میرے خیالات جیسے کچھ ہیں ان کو صرف اس نظر سے پیش کرتا ہوں کہ اگر ممکن ہو تو میری اصلاح کیجیے، اور اگر میری اس پریشان تحریر میں آپ کے نزدیک کوئی کام کی

بات ہو تو اللہ اُس پر توجہ کیجیے، وقت ایسا نازک ہے کہ مسلمان تباہ ہوتے چلے جاتے ہیں، اور ان کی کوئی خبر نہیں لیتا، اللہ تعالیٰ نے آپ کے کلام میں اثر دیا ہے۔ اگر آپ کے نزدیک میں سچ کہتا ہوں تو اس کو سنیے، اور اگر غلطی پر ہوں تو میری اصلاح کیجیے، آخر آپ کا ہوں، مجھ کو بچائیں کہ قیامت کے دن فضیحت نہ ہوں، اگر آپ کے نزدیک میری فلاح اس میں ہو کہ میں نوکری چھوڑ دوں تو مجھ کو صاف صاف ہدایت کیجیے، ورنہ میں تو من و عن آپ پر ظاہر کر چکا۔

سترہویں شبے کی تقریر: اب میں اپنے عیب کھولنے پر آیا تو ایک اور بات بھی لکھ دوں، کیوں شبہ کو اپنے دل میں رکھوں، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص عرب کی اصلاح کے لیے بھیجا تھا، یا ساری دنیا کی اصلاح کے لیے، میرا خیال یہ ہے کہ صرف قوم عرب کی اصلاح کے لیے، کیوں کہ اس زمانے کے عرب اپنی زبان میں بڑے فصیح و بلیغ تھے، ان کے لیے قرآن زبان عربی میں نازل فرمایا، جس سے ان کو یقین ہو گیا کہ وہ کلام بشر نہیں ہے، اور ان کو ماننا پڑا، اور تمام عمر جناب پیغمبر خدا اسی قوم میں رہے، اور جب ان کی تکمیل ہو چکی آپ نے وفات فرمائی، دیگر اقوام نے آپ کے قرآن کو اس بنیاد پر نہیں مانا تھا جس پر کہ عرب نے مانا تھا۔ بلکہ ان لوگوں کو قوم عرب نے بزور شمشیر زیر کیا، اور ان کو زبردستی مسلمان کیا، انھوں نے آپ سے معجزے طلب نہیں کیے، اور نہ مثل عرب کے قرآن پر ایمان لائے۔

فتوحات میں دو اقسام ہوئیں، ایک وہ جنھوں نے عاجز آ کر اور مقابلے کی تاب نہ لا کر اسلام قبول کیا۔ دوسری وہ جنھوں نے امن مانگی، اور اپنے دین پر قائم رہ کر جزیہ دینا قبول کیا، ان پر دعوت اسلام پوری نہیں ہوئی۔ سب سے بڑی بات غور طلب یہ ہے کہ جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم تمام جہان میں تشریف نہیں لے گئے، اور بہت لوگوں کو اس وقت بھی آپ کے پیغمبر ہونے کی خبر نہیں ہوئی۔ ہندوستان میں اسلام بہت زمانے کے بعد آیا، پھر جو ہندو یہاں رہتے تھے ان کی ہدایت کیا ہوئی؟ اور یہی حال امریکہ اور افریقہ اور بڑے حصہ یورپ اور ایشیا کا تھا، ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک خاص فرقے کے اندر پیدا کیا، اور اس میں وہ مر گئے۔ فقط

تقریر پر جوابات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد لله رب العالمین، والعاقبة للمتقین، والصلاة والسلام علی

رسوله سیدنا محمد وعلی آلہ وأصحابہ أجمعین.

بعد حمد و صلاۃ کے! احقر نے مخاطب عزیز کی تمام تر تقریر کو کئی بار دیکھا۔ چوں کہ مثل اظہار مرض کے تشخیص مرض و تعیین اسباب میں بھی معالج کو شرم کرنا مضر ہے، اس لیے ضرور ٹھہرا کہ آزادی کے ساتھ کلام کیا جاوے، اس لیے اولاً اجمالی طور پر اسباب کو متعین کرنا ضروری سمجھتا ہوں، جہاں تک تقریر مذکور کو دیکھا اور پڑھا معلوم ہوا کہ منشا ان خیالات کا صرف دو امر ہیں:

اول: علم شریعت میں مہارت کا ملہ نہ ہونا۔

دوسرے: لامذہبوں کی تقریریں اور تحریریں سننا اور دیکھنا۔

اس لیے علاج کلی تو یہ ہے کہ بقدر فرصت کسی قدر توجہ کر کے کم از کم ترجمہ قرآن مجید و ”مشکاۃ شریف“ کے بعض ابواب اور فقہ کی ایک پوری کتاب کسی سمجھ دار آدمی سے پڑھ لیا جاوے، اور مدعیان تحقیق و تہذیب جدید کی تقریرات و تحریرات سمجھ و بصر تک نہ آنے دیا جاوے۔ اور جزئی علاج یہ ہے کہ تقریر مذکور کے جواب کو جس کو بعد اجمال ہذا کے تفصیلی طور پر لکھنا چاہتا ہوں بغور و انصاف خالی الذہن ہو کر دیکھا جاوے۔ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ سب شبہات دفع ہو جاویں گے، اور اصلاح عقیدہ توفی الفور اور اصلاح عمل بتدریج حاصل ہو جاوے گی۔ اب وہ جواب تفصیلی سننا چاہیے۔

پہلے شیعہ کا جواب: سب سے اول مخاطب عزیز نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ جس نگاہ سے شریعت اور اتباع شریعت کو ہندوستان میں علمائے دین دیکھتے ہیں وہ شرائط اسلام نہیں ہیں۔ اور اس کو تاریخی دلائل سے جس سے انقلاب اقوام کا معلوم ہوتا ہے ثابت کیا ہے۔ مقام انصاف ہے کہ جن لوگوں کی تمام عمر ایک علم کی تحصیل و ترقی میں گزر گئی ان کی نگاہ جب قابل اعتبار نہیں تو

ایک مؤرخ کی نگاہ احکام شریعت کی تحقیق میں کس طرح لائق اعتماد ہوگی؟ پھر یہ کہ عالم دین تو اپنے ہر دعوے کے اثبات کے لیے قرآن مجید کی آیات اور حدیث شریف کی روایت جو اللہ ورسول کا کلام صادق ہے پیش کریں، اور مؤرخ صرف اپنی رائے اور قیاس سے استدلال کرے، پھر بھی عالم کا قول معتبر نہ ہو، اور صاحبِ رائے کی رائے کو ترجیح ہو، اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ اہل الرائے کی نظر سے ابھی جمالِ شریعت مجھوب ہے، اور جس قدر پیش نظر ہے وہ محض ایک ناخن ہے، لیلیٰ راہچشم مجنون باید دید کا یہی مطلب ہے، میں صرف اسی مجمل انصاف پر قناعت نہ کروں گا، بلکہ اس تاریخی دلیل کی حالت دکھلاؤں گا۔

خلاصہ اس واقعہ تاریخی کا صرف مسلمانوں اور دیگر اقوام کی حالت کا موازنہ کرنا ہے، اور بدون نئے رنگ کے اسلامی سلطنت کا قائم نہ رہ سکتا ہے، سو اقوام کی ترقی و تنزل کی بحث اور اس کے اسباب کی تعین یہ محض زائد مضمون ہے، البتہ دوسرا امر قابل توجہ ہے کہ بدون اس نئے رنگ کے حکومت کا قائم نہ رہ سکتا اور قومی تاریخ کے لکھنے سے بھی مخاطبِ عزیز کا مقصود یہی ہے، سو یہ امر اب تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کون سا نیا رنگ جو علمائے ہند کے نزدیک خلافِ شریعت ہے اور اس پر قیامِ سلطنت ہے، اگر مراد اس سے جدید سامانِ حرب و حفاظتِ حدود ہے، سو اس کو کون سے ہندوستانی عالم نے خلافِ شریعت بتلایا ہے، اگر مسئلہ تشبہ سے شبہ پڑا ہے، سو مسئلہ تشبہ کا اول تو ہندوستانی علما کا ایجاد نہیں ہے، قرآن مجید میں موجود حدیث میں مذکور، تمام دنیا کے علما اس میں شریک، اور اگر کوئی عالمِ رومی، روسی اس کے مخالف ہو وہ قرآن و حدیث کا مخالف ہو کر متروک القول قرار دیا جائے گا۔ پھر یہ کہ سامانِ حرب مسئلہ تشبہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، اور یوں مسئلہ تشبہ کی تحقیق نہ ہونے سے شبہ پڑ جاوے وہ اور بات ہے، بہر حال جس پر بقائے سلطنت موقوف ہے اس کو مسئلہ تشبہ سے کوئی علاقہ نہیں، اور اگر مراد اس سے میز کرسی پر کھانا کھانا، مکانات میں تصاویر کا لٹکانا وغیرہا ہے تو اس کو بقائے سلطنت سے کوئی علاقہ معلوم نہیں ہوتا، بہر حال وہ نیا رنگ سمجھ میں نہیں آتا جس کو اہل فتویٰ حرام کہتے ہوں، اور سلطنت بدون اس کے قائم نہ رہ سکے۔

اور اگر واقع میں کوئی ایسا نیا رنگ ہے جو خلاف شریعت بھی ہے اور بقائے سلطنت کا موقوف علیہ بھی ہے، اور پراگندہ روزی پراگندہ دل سے بچنے کے لیے اس نئے رنگ کو گوارا کیا جاتا ہے تو خود مخاطب عزیز تھوڑی دیر کے لیے حق جل و علا شانہ کے تعلقات و حقوق اور سلطنت و ثروت کے فانی ثمرات کو میزان عقل و انصاف میں تول کر دیکھ لیں کس کا پلہ بھاری ہوتا ہے؟ میں پوچھتا ہوں: ڈکیتی قانوناً جرم ہے، لیکن اگر اسی قاعدے کی بنا پر کہ ہم ایسا قانون لے کر کیا کریں گے جس سے پریشانی ہو، اور مال کی تنگی ہو، برابر ڈکیتی کیا کرے، اور گورنمنٹ کی ناراضی کا مطلق پاس نہ کرے، اس شخص کے واسطے عقلاً کیا حکم کیا جاوے گا؟ کیا اس کے لیے ڈکیتی کو جائز کیا جاوے گا؟ وہ افلاس جو حاکم وقت کی خوشنودی کے ساتھ ہو، اس ثروت سے جو ارتکاب جرم کے ساتھ ہو ہزار لاکھ درجہ افضل کہا جاوے گا، پھر تعجب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدر گورنمنٹ کے برابر بھی نہ ہو۔

میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی ایسا وقت آوے کہ بلا کفر اختیار کیے ہوئے سلطنت قائم نہ رہ سکے تو مسلمان رہ کر مر جانا اچھا ہے یا کافر ہو کر زندہ رہنا؟ اور پھر آخری بات یہ ہے کہ اگر باوجود فسق و کفر کے تمام اقوام متفق ہو کر کسی خاص قوم کی سلطنت چھین لیں، اور فسق و کفر بھی آڑ نہ بن سکے تو اس وقت پراگندہ روزی پراگندہ دل کا کیا علاج ہوگا؟

عزیز من! مال و جاہ مقصود بالعرض ہے، مقصود اصلی رضائے حق ہے، اگر رضائے حق کے ساتھ ان دونوں کی حفاظت ہو سکے مضائقہ نہیں، ورنہ وہ دونوں کے روز کام آویں گے؟ اور پھر آخری انجام کیا ہوگا؟ کیا مریض کو بد پرہیزی سے روکنا گوارا نہیں ہوتا؟ کیا اس کا دل پریشان نہیں ہوتا؟ مگر اس عاقبت اندیشی کی وجہ سے نعمتِ صحت کو اس عارضی لذت بد پرہیزی پر ترجیح دی جاتی ہے، اور طبیب مشفق اس ناگواری و تنگی کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں کرتا۔

اس کے بعد جو دوسرا نتیجہ نکالا کہ اسلام ہم کو حکومت اور سلطنت نہیں سکھاتا، بلکہ ذلت اور در یوزہ گری سکھاتا ہے، فی الواقع اسلام ایسی سلطنت نہیں سکھاتا جس کا انجام نارنجنم ہو، اور اگر ایسی سلطنت کی بھی اجازت ہو تو بس قیامت کے روز فرعون بھی عرض کر دے گا کہ مجھ کو تیرے

سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اگر میں خدائی کا دعویٰ نہ کرتا تو میری حکومت جاتی رہتی، لوگوں میں ذلت و خواری ہوتی، بقائے سلطنت کے لیے میں عمر بھر یہ دعویٰ کرتا رہا۔ کیا یہ عذر اس کا مقبول ہوگا؟ اور علی سمیل التزل میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص نہایت عرق ریزی کر کے یہ بات ثابت کر دے کہ بقائے سلطنت ضروری ہے، اور وہ بدون ارتکابِ معصیت کے ناممکن ہے، تو اس کی ضرورت بقا کو مان کر کہا جاوے گا کہ یہ مسئلہ اکراہ کا ہے، شریعت نے اس کا قانون بھی مقرر کر دیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ بعض مجبوریوں میں ارتکابِ ظاہری کی اجازت ہوگی، مگر قلب سے کراہت و نفرت شدید ضروری ہے، کیوں کہ شرح صدر و طیب قلب کی تو کوئی ضرورت نہیں، نہ کسی مخلوق کو اس کا علم ہے جو اس شخص سے کراہتِ قلب پر مواخذہ دار و گیر کر سکے، غرض! پھر بھی مخالفتِ شریعت کی اجازت نہ ہوئی، جو مخالفتِ ظاہری ہوئی ہے وہ بھی قانونِ اتباع میں داخل ہوگئی۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ اگر ایسی مجبوری ہوگی تو سلاطین کو ہوگی، ہم عوام الناس کی کون سی حکومت و سلطنت ہاتھ سے نکلی جاتی تھی کہ ہم کو بھی ارتکابِ مخالفت کی ضرورت پڑی۔ غرض! سلاطین کی مجبوری ہمارے لیے مفید مطلب نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد جو لکھا ہے کہ اگر سلطانِ روم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ساطرینہ اختیار کریں تو سلطنت نہیں کر سکتے، سوا اول تو یہ حکم رجماً بالغیب قابلِ تسلیم نہیں ہے کہ سلطنت نہیں کر سکتے، اگر کوئی شخص اس کے مناقض دعویٰ کرے کہ زیادہ خوبی کے ساتھ سلطنت کر سکتے ہیں تو اس کی تکذیب کی کیا دلیل ہے؟

اور اگر بالفرض مان بھی لیا جاوے جب بھی ہم کو مضر نہیں، کیوں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے طریقے میں دو قسم کے امور ہیں، ایک وہ جو فرض و واجب ہیں، ان کی پابندی تو کسی حال میں مضر سلطنت ہرگز نہیں۔ دوسرے وہ جو شرعاً ضروری نہیں، مثلاً: رات کو گشت کرنا وغیرہ وغیرہ۔ سو شریعت نے اس کا مکلف ہی نہیں بنایا۔ غرض! جو امر شرعاً ضروری ہے وہ مضر سلطنت نہیں، اور جو مضر سلطنت سمجھا جاتا ہے وہ شرعاً ضروری نہیں۔ سو یہ دعویٰ کیسے ثابت ہو کہ فتویٰ شریعت پر عمل کرنے سے سلطنت نہیں کر سکتے۔

دوسرے شیعے کا جواب: اس کے بعد یہ لکھا ہے کہ اس وقت ملکِ علم سے قائم ہے، شمشیر سے نہیں، اور اس کو باروت گولے کی ایجاد سے ثابت کیا ہے۔ عزیز من! اول تو جیسا باروت گولے کا علم ہے، شمشیر زنی کا بھی علم ہے، اور اگر شمشیر زنی کو علم نہیں کہا جاتا تو گولہ بازی کو علم کہنے کی کوئی وجہ نہیں، غرض یا تو پہلے زمانے میں بھی ملک کو علم سے قائم کہا جاوے گا، یا اس زمانے میں بھی علم کا دخل نہ مانا جاوے گا، پھر اگر یہ بھی مان لیا جاوے کہ وہ علم نہ تھا، یہ علم ہے۔ تو اس سے کیا مطلب حاصل ہوا؟ ان علوم کو کسی مفتی ہندی نے خلافِ شریعت بتلایا ہے، جس کی وجہ سے تنزل کا الزام فتویٰ علمائے ہند پر لگایا جاوے۔

تیسرے شیعے کا جواب: رہا یہ افسوس کہ مسلمانوں نے اللہ کی نعمتوں کی قدر نہ کی، اور بے قدری کی یہ دلیل کہ پانی سے وہ کام نہ لیا جس کے وہ شایاں تھا، بس پیاس میں پی لیا، وضو کیا، غسل کیا، طہارت کی، مخاطبِ عزیز کی خوش فہمی کے اعتبار سے نہایت تعجب خیز تقریر ہے، اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وضو و غسل وغیرہ سے بڑھ کر وہ کام ہے جو اس سے اب لیا جا رہا ہے۔ بس اس کے متعلق اتنا دریافت کرنا ہے کہ واقع میں یہ جدید صفتیں بہ نسبت وضو و غسل و طہارت کے زیادہ اہتمام کے لائق ہیں تو حق جل و علا شانہ نے حضراتِ انبیاء علیہم السلام کے ذریعے سے ایسے کم درجے کے فوائد تو کس اہتمام سے تعلیم فرمائے، اور ان صنائع سے ہزاروں سال تک اپنے بندوں کو اطلاع نہ دی، اس کی کیا وجہ ہے؟

دوسرے یہ کہ قیامت میں بقول مخاطبِ عزیز کے اُن لوگوں سے جب سوال بے ترکیبی کا غالباً ہوگا جنہوں نے صرف طہارت و غسل وغیرہ میں پانی کا استعمال کیا تو ضرور ان لوگوں کے بڑے درجے ہوں گے جنہوں نے جدید صنائع میں کام کیا، گو ایک وقت بھی نماز نہ پڑھی ہو، گو عمر بھر جنابت و خباثت میں گزری ہو، کیوں کہ عملِ اعلیٰ کے رو برو عملِ ادنیٰ کا عدم ہے تو اس بنا پر رات دن کی عبادت کرنے والے کندہ دوزخ ہوں گے، اور فساق و فجار بلکہ کفار بھی نعوذ باللہ مقیم جنت ہوں گے، کیا سچ مچ کسی حساب و کتاب کے اعتقاد رکھنے والے کا دل اس کو قبول کرتا ہے؟

چوتھے شہبے کا جواب: رہا یہ سوال کہ مسلمانوں نے اس طرف کیوں توجہ نہ کی، اس کو اصل مقصود سے کہ دعویٰ و جوہ اتباع شریعت ہے کچھ تعلق نہیں ہے، نہ آج تک کسی نے ان امور کو خلاف شریعت کہا، پھر خواہ اس کی کچھ ہی وجہ ہو، بلکہ اگر ہم سستی و کاہلی ہی کو اس کا سبب قرار دے لیں، جیسا کہ مقصود سوال کا ہے تب بھی ہم کو اپنے اصلی دعوے سے کہ اتباع شریعت واجب ہے، دست بردار ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، اس لیے اس میں گنگنا کرنا محض لاجواب حاصل ہے۔

پانچویں شہبے کا جواب: اس کے بعد مقاصد اسلام سے لاعلمی کا اظہار کیا ہے، یہ اور زیادہ تعجب انگیز بات ہے، اسلام کے احکام و مقاصد تو اس قدر مشہور و معروف ہیں کہ شاید مخالفین، ہندو و منکرین اسلام بھی اس کو جانتے ہوں، گو کسی وجہ سے نہ مانتے ہوں۔

چھٹے شہبے کا جواب: رہا یہ امر کہ جس چیز کی طرف مسلمانوں کو بلایا جاتا ہے وہ اس سے بہت دور نکل گئے ہیں۔ عزیز من! یہ شامت مسلمانوں کی ہے کہ اپنے مالک حقیقی کے احکام سے ایسے اجنبی ہو گئے ہیں تو کیا ان کی حالت متغیر ہو جانے سے اسلام کو چاہیے کہ اپنی حالت متغیر کر کے لاندہ ہی کا نام اسلام قرار دے دے، جس سے وہ مسلمانوں میں ضرور شمار کیے جاویں۔

یاد رکھنا چاہیے کہ احکام اسلام کی اس قدر کافی تکمیل ہو چکی ہے کہ قیامت تک اس میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا، جو کوئی اس کو مانے گا نجات ہوگی، نہ مانے گا خسراں ابدی میں مبتلا ہوگا، اگر تعلیم احکام کے لیے یہ بھی ضرور ہے کہ لوگوں کے حالت سے اس کو بہت بعد نہ ہو تو پیغمبر ﷺ

و جمیع انبیاء علیہم السلام طوفان بے تمیزی کے زمانوں میں بت پرستی کو روکنے کیوں تشریف لائے تھے؟ حضرت نوح علیہ السلام بنص قرآنی ساڑھے نو سو برس تک اسی دھن میں لگے رہے، اور کبھی یہ خیال نہ فرمایا، نہ من جانب اللہ ان کو حکم ہوا کہ تم ایسی چیز کی طرف کیوں بلا تے ہو جس سے وہ کوسوں دور نکل گئے ہیں، کفار کے نہ مانتے سے یہ نہ ہوا کہ اس کلمہ توحیدی میں تخفیف و رعایت ہو جاتی، بلکہ منکرین کو عذاب طوفان میں مبتلا کیا گیا، قرآن مجید کے صاف الفاظ میں یہ قصہ

اگر کوئی شخص دہلی جانا چاہتا ہو، اور غلطی سے کلکتہ کی راہ ہو لے، جب دہلی سے سینکڑوں میل کا بعد ہو جاوے، کوئی شخص اس کو متنبیہ کرے کہ دہلی کا راستہ یہ نہیں ہے، تو کیا کوئی شخص اس مشورہ دینے میں حق پر سمجھا جاوے گا کہ اب تو دہلی سے بہت دور ہو گیا ہے اس طرف مت بلاؤ، کلکتہ کا نام دہلی رکھ کر اس میں جانے دو؟

مذکور ہے، پھر اس وقت میں اگر ایسی ہی بے تمیزی عام ہو جاوے تو کیا علما کو واجب یا جائز ہوگا کہ احکام میں تحریف کر دیں؟ یا برابر اظہارِ حق کیے جاویں۔

ساتویں شبے کا جواب: اور یہ جو لکھا ہے کہ جو باتیں ہمارے علمائے دین تعلیم کرتے ہیں، زمانہ موجود کی موافق ذلت اور خواری کے سوا کچھ نظر نہیں آتا بلخ اس کی نسبت اس قدر کہنا کافی ہے کہ جو کچھ وہ تعلیم کرتے ہیں، آیا موافق وحی کے تعلیم کرتے ہیں یا اپنی رائے سے؟ اگر کہا جاوے کہ اپنی رائے سے کرتے ہیں تو محض غلط ہے، اس واسطے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ برابر دعوے کے لیے آیت و حدیث پیش کرتے ہیں، پھر ہم کس طرح کہیں کہ اپنی رائے سے تعلیم کرتے ہیں، لامحالہ قائل ہونا پڑے گا کہ وہ تعلیم موافق وحی کے ہے، پھر یہ اعتراض کس پر ہوا؟ نعوذ باللہ یہ تو حضرت حق جل جلالہ پر اعتراض ٹھہرا کہ ایسے احکام کیوں مقرر کیے جو اس زمانے میں موجب ذلت ہیں، پھر اس اعتراض کا جواب تو صرف علما کے ذمے نہیں، بلکہ ہر مسلمان کے ذمے ہے۔

اب اس کی اصلی وجہ سننا چاہیے کہ اتباعِ احکام سے اگر کسی وقت میں ذلت و خواری ہو تو آیا ان احکام میں کوئی فتور ہے یا کسی مخلوق کا قصور ہے۔ اس کے دریافت ہو جانے سے ہزاروں شبہات بلکہ تمام شبہات مٹ جاویں گے۔ اول: عزت و ذلت عند الخلق کی حقیقت سمجھنا ضرور ہے، یہ دونوں صفتیں موجوداتِ حقیقیہ میں سے نہیں، بلکہ موجوداتِ اضافیہ میں سے ہیں، یعنی خلق کے علم و اعتقاد میں کسی کی حالت کا عظیم ہونا یہ اس صاحبِ حالت کی عزت ہے، اور کسی حالت کا حقیر ہونا یہ اس صاحبِ حالت کی ذلت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ صفتیں اعتقاد و ذمہ خالق کے تابع ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک شخص برہنہ میلا کچھلا ایک معتقد کی نظر میں بہت بڑا ہے، اور دوسرے کی نظر میں محض رسوا و خوار ہے، جب یہ بات معلوم ہو چکی تو اب سمجھو کہ اسلامی حالت بھی موجبِ اعزاز اس شخص کی نظر میں ہو سکتی ہے جو احکامِ اسلام کو نظرِ عظمت سے دیکھتا ہو۔ بخلاف اس شخص کے جو خود اس کو ہی ایک امر لغو و بے کار سمجھتا ہو اس کی نظر میں وہی امر جو موجبِ عزت تھا موجبِ ذلت ہوگا۔ تو اس میں احکام کا کیا قصور ہوا؟ غلط بینی اس

شخص کی ہوئی جو اپنے عقیدے میں اس کو موجب حقارت سمجھتا ہے۔

اب انصاف کرنا چاہیے کہ اگر کسی کا اعتقاد یقیناً غلط ہو، اور وہ اس لیے اتباع احکام کو موجب ذلت سمجھتا ہے، تو کیا اس کے اعتقاد غلط کا اتباع کر کے اس امر کو چھوڑ دیا جاوے گا؟ یا خود اس شخص کو غلط کار سمجھ کر اس امر حق پر استقامت و استقلال سے قائم رہا جاوے گا؟ سو اگر ایک شخص نے رشوت کو برا سمجھا، اور سود کو برا سمجھا، ناجائز نوکری کو برا سمجھا، اور گھاس کھود کر اپنا پیٹ پالا، اس نے عقل کی رو سے کیا برائی کی؟ پھر اس حالت کو حقیر سمجھنے سے کیا اس کو حق تعالیٰ کی مخالفت کر کے اللہ تعالیٰ کی نظر میں ذلیل بن جانا چاہیے؟

اندلس میں ایک زمانہ گزرا ہے کہ خود مسلمان رہنا ذلت کی بات تھی، اور بدون عیسائیت کے ہرگز آبرو و جان محفوظ نہیں رہ سکتی تھی، تو اب اس مقدمہ خاص میں کیا ان لوگوں پر الزام ہوگا جنہوں نے اسلام پر قائم رہ کر آبرو اور ایمان جان سب قربان کر دی؟ یا ان ظالموں کا قصور قرار دیا جاوے گا جنہوں نے اس عزیز حالت کو موجب ذلت و غضب قرار دیا؟ کیا حضرات انبیاء علیہم السلام کے ساتھ کفار نے کوئی دقیقہ نحوذ باللہ ایذا و اہانت کا اٹھا رکھا؟ کیا کھلم کھلا گالیاں نہیں دیں؟ کیا ان کو سنگ بار نہیں کیا؟ پھر انہوں نے ان ہی بہشت اور حوروں کی توقع میں اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی تحصیل کے لیے کیوں اس ذلت و اذیت کو گوارا کیا؟ افسوس ایسی موٹی بات میں فہیم لوگ غور نہیں کرتے۔

اور اگر قلت مال کا نام ذلت ہے تو چاہیے دنیا میں چور و فزاق جو بڑے مال دار ہیں نہایت معزز قرار دیے جاویں، اور ان حرام ذرائع کی نسبت جس میں آمدنی بالکل محدود ہے اس چوری و فزاقی کو ترجیح دی جاوے، چوری و فزاقی اسی لیے موجب ذلت ہے کہ قانونی جرم ہے، پھر اگر قانون الہی کے اعتبار سے کوئی چیز جرم ہو تو اس کو کیوں موجب اعزاز قرار دیا جاتا ہے؟ اچھا اعزاز بھی ہوا، لیکن بعد مرگ جب کشاکشی ہوگی تو کیا یہ دلائل اس وقت مقبول و مسموع ہوں گے؟ بس بات یہ ہے کہ کسی کو یہاں ذلت و ہاں عزت، کسی کو یہاں عزت و ہاں ذلت، اب اس میں ہر معتقد آخرت فیصلہ کر کے ترجیح دے سکتا ہے۔

آٹھویں شبے کا جواب: اور یہ کہنا کہ جس طریقے سے علما بتلاتے ہیں دنیا بقدر ضرورت بھی حاصل نہیں ہوتی، بالکل غلط ہے، اور اس کے ثبوت کے لیے جو مثال فرض کی ہے کہ ایک شخص کو عالم بنایا، اب وہ کیا کرے الخ سوال تو یہ کہتا کون ہے کہ ہر شخص عالم اصطلاحی بنایا جاوے، اہل تحقیق تو یوں کہتے ہیں کہ جس شخص کو اطمینان قلب میسر ہو، خواہ کسی ذریعہ ظاہری سے، خواہ قوت توکل سے، وہ علم دین میں تکمیل کرے، اور عمر بھر خدمت دین میں مصروف رہے، اس کے حق میں تو یہ سوال ہی نہیں ہو سکتا کہ وہ کیا کرے۔ رہ گئے بے اطمینان و حریص و طماع لوگ ان کو چاہیے کہ بقدر ضرورت احکام دینیہ یاد کر کے اپنی معاش میں مشغول ہوں، اور وقتاً فوقتاً اہل علم سے اپنے واقعات و ضروریات کے متعلق تحقیق و تفتیش کرتے رہیں، ان کے حق میں یہ سوال معقول ہے کہ کون سا کام کریں، سو یہ تو دل کھول کر باواز بلند کہا جاوے گا کہ حرام کام نہ کریں، پھر مباح کام میں لوہار و بڑھی اور تار برقی اور ریل سب کام برابر ہیں، اس کو کس نے منع کیا ہے؟ اگر کوئی شخص ان صنائع کی تعلیم کا اہتمام کرے، بڑی خوشی کی بات ہے، مگر ان سب کاموں کے لیے چاہیے روپیہ، جو اصلاح چاہتے ہیں وہ بے زر ہیں، جو زردار ہیں ان کو بجز اس کے کہ مسلمانوں کو وحشی اور بدتہذیب بتلائیں، اور ان کی وحشت اور بدتہذیبی کا علاج دہریت کو بتلائیں، اور کچھ آتا نہیں۔ خیر بہر حال! خواہ اس کا اہتمام کیا جاوے، یا نہ کیا جاوے، یہ خلاف شرع کسی کے نزدیک نہیں۔

نویں شبے کا جواب: اس کے بعد مدارس اسلامیہ پر اعتراض ہے کہ ہمارا یہ کام نہیں جو آیا پڑھا دیا، بلکہ وہ مفید طرز اختیار کریں جس سے ہمارے بھائیوں کو نفع پہنچے، یہ تشریح نہ کی گئی کہ اس سے نفع دنیوی مراد ہے یا نفع دینی؟ اور دنیوی نفع مراد ہے تو کیا صرف اسی کا حاصل کر لینا کافی ہے؟ اور کیا نفع دین کی احتیاج نہیں ہے؟ اور اگر نفع دینی مراد ہے تو کیا اس کے لیے تعلیم علوم دینیہ کی حاجت نہیں، اور کیا مدارس سے یہ نفع حاصل نہیں ہو رہا؟ یہ میں نہیں کہتا کہ اگر سوطالب علم پڑھتے ہیں تو ہر شخص ان میں سے ابوحنیفہ وغزالی بن جاتا ہے، مگر یہ بھی ضروری بات ہے کہ بہت سے ان میں کام کے بھی ہوتے ہیں، جن سے ہزاروں کو نفع پہنچتا ہے، جس شخص نے

تفصیلاً مدارس و فضلاء فارغین کا مشاہدہ کیا ہے اس کے نظر میں یہ امر محسوس ہے۔

اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ اس میں کوئی اصلاح کی ضرورت نہیں، بہت سی اصلاحوں کی ضرورت ہے۔ لیکن اگر سستی یا قلت سرمایہ سے یا اور کسی وجہ سے اس اصلاح میں توقف ہو تو کیا جتنا کام ہو رہا ہے اس کو بھی موقوف کر دیا جائے؟ پھر اگر ہمت کر کے کوئی یہی کہہ دے کہ ہاں موقوف کر دیا جاوے تو اس سے یہ پوچھا جاوے گا کہ پھر علوم دینیہ کا بقا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر کہا جاوے کہ کچھ ضروری نہیں ایسے شخص سے تو خطاب ہی لا حاصل ہے، اس کو بجائے اس کے کہ ضرورت علم دین کی اس کی رو برو ثابت کی جاوے تجدید اسلام کا مشورہ دیا جاوے گا، اور اگر ضروری ہے تو اس سلسلے کے بقا کا پھر کیا طریقہ ہے؟ ظاہر ہے کہ بجز تعلیم و تعلم کے اور کوئی طریقہ نہیں، پھر مدارس عربیہ میں جس قدر ہو رہا ہے ثابت ہوا کہ وہ غنیمت ہے، اس کو بے کار وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس کو اپنے افعال و اقوال کی نسبت یہ فکر نہ ہو کہ آیا یہ سب مرضی حق تعالیٰ کے موافق ہیں یا مخالف، جب یہ فکر ہوگی اس کی تفتیش کے درپے ہوگا، اور تفتیش کے بعد ان لوگوں سے پتہ لگے گا جو پھٹی لنگی اور پیوند زدہ کرتے ہیںے ایک گھنٹہ چٹائی پر ایک بوسیدہ کتاب کے مطالعے میں مشغول ہیں، جب روز روز اس سے مشکلات حل ہوں گے جب سمجھ میں آوے گا کہ یہ جماعت کس کام کی ہے؟ اور اس کام کی کتنی ضرورت ہے؟ اور وہ ان ہی بے نظم مدارس سے چل رہا ہے، اور جس کو اس کی ضرورت نہ ہو واقعی اس کے نزدیک یہ سب قصہ مہمل ہے۔

اور آگے جو قصہ ایک خدمت گزار و معتقدِ علما کا لکھا ہے کہ وہ ضروری مسائل سے ناواقف تھا، سو اس میں علما کا کیا تصور ہے؟ یہ اس شخص کی بے توجہی ہے کہ اس نے کبھی کسی سے نہ پوچھا، اور بے پوچھے علما کس کس چیز کو بتلاتے پھریں؟ ان کی مثال طبیب کی سی ہے کہ کسی مریض نے کچھ شکایت کی، قارورہ و نبض دیکھ کر نسخہ لکھ دیا۔ ضروری کام تو ان کے ذمہ اسی قدر ہے، البتہ بعض ایسے عالی ہمت بھی ہیں کہ مسلمانوں کی حالت کی خود نگہ رانی کر کے ضروریات کی اطلاع دیتے ہیں، اس کا طریق و عظ گوئی ہے، سو دکان دار و اعظین تو کسی شمار و قطار میں نہیں، محض جاہل ہیں، ان میں جو خیر خواہ و ہمدرد و اعظ ہیں ان کے ساتھ حکام و رعایا کی طرف سے جو

معاملہ ہوتا ہے۔ بجز انبیا و اولیا کے اس کا کوئی محتمل نہیں ہو سکتا، اب کس برتے پر وعظ کہیں، سوائے اس کے کہ ایک گوشے میں بیٹھ جاویں، اور جوان سے دریافت کرے جواب دے دیں، اور بیٹھے بٹھلائے خطرے میں پڑنا ہر شخص کی ہمت نہیں، نہ عقلاً و نہلاً کوئی اس کا مکلف ہے۔

اس کے بعد علما کی حالت کو اصلاح کے قابل بتلایا ہے، میں اس کا بھی انکار نہیں کرتا، لیکن اگر شامتِ اعمال سے کسی عالم نے اپنی حالت درست نہ کی تو ان کا یہ کہنا تو غلط نہیں ہو سکتا کہ اتباعِ شریعت واجب ہے، ان کے اس قول پر تو عمل کرنا ضروری ہوگا، غایۃ مافی الباب یہ کہ ان سے بھی کہا جاوے گا کہ تم کیوں نہیں عمل کرتے، یہ کیا وجہ کہ ان کی درستی کا انتظام کیا جاوے، اور اس کے بعد اپنی درستی کا وعدہ کیا جاوے، اپنی درستی کے لیے تو ان کا قول کافی ہے، اور اگر فعل ہی کی ضرورت ہے تو کیا تمام علما کے افعال نا درست ہیں؟ پھر ان کی تقلید کیوں نہیں کی جاتی؟ جب درستی کا ارادہ نہیں ہوتا ہزاروں حیلے نکل آتے ہیں، اور عازم درستی کے لیے ہر وقت درستی ممکن ہے۔

دسویں شبے کا جواب: اس کے بعد ترمیمِ نصابِ تعلیم کو سند کے طور پر لائے ہیں کہ زمانے کے بدل جانے سے احکام بدل جاتے ہیں، اور اس سے کوٹ پتلون کا جواز ثابت کرنا چاہا ہے، عزیزِ من! تمام امور دو قسم پر ہیں: مقاصد اور ذرائع، مقاصد جو شریعت نے مقرر کر دیے ہیں، آسمان بدل جائے، زمین بدل جائے، مگر وہ نہیں بدلتے، اور زمانے کے بدلنے سے تو وہ کیا بدلیں گے۔ ان احکام کا بدلنے والا ملحد و زندقہ ہوتا ہے۔ رہ گئے ذرائع، وہ اصل میں ان مقاصد کی تحصیل کے لیے ہوتے ہیں، سو ممکن ہے ایک زمانے میں ایک مقصود کسی خاص طریقے سے حاصل ہوتا ہو، اس زمانے میں وہ طریق مطلوب ہوگا، دوسرے زمانے میں وہ مقصود دوسرے طریق سے حاصل ہونے لگا، اس لیے طریق اول کو چھوڑ کر دوسرا طریق اختیار کیا، بشرطے کہ دوسرا طریق کسی نص سے ممنوع الاستعمال نہ ہو، اس کی مثال یہ ہے کہ حج مقصود ہے، اور ہوائی جہاز میں سفر کرنا اس کا طریق، اب حج میں تو کسی مصلحت سے تغیر نہیں ہو سکتا، مثلاً: حج ماہِ ذی الحجہ میں ہوتا ہے، کسی شخص کو محرم میں فرصت ہوتی ہے، اس کے لیے محرم میں

جائز ہو جاوے، یہ ناممکن ہے، اور طریق میں تغیر ہو سکتا ہے، مثلاً: بجائے ہوائی جہاز کے اب دھانی جہاز چلنے لگا، اب پہلا طریق ترک کر کے دوسرا اختیار کرنا جائز ہے۔

جب یہ قاعدہ سمجھ میں آ گیا تو سمجھنا چاہیے کہ تحصیلِ علم دین مقصود ہے، اور نصابِ خاص اس کا آلہ اور ذریعہ، کسبِ حلال مقصود ہے، حرفت اور صنعت اس کا آلہ، سوزمانے کے بدلنے سے اگر نصابِ تعلیم بدل دیا جانا جائز ہو تو اس سے مقاصد کی تبدیل کا جواز لازم نہیں آتا، اور حرمتِ تشبیہ بالکفار مقاصدِ شرعیہ میں سے ہے، قرآن وحدیث میں یہ مسئلہ مذکور ہے، سو جب تک کسی امر میں تشبیہ رہے گا، وہ کسی زمانے کے بدلنے سے نہیں بدل سکتا، البتہ اگر کسی وقت میں کسی وجہ سے تشبیہ ہی نہ رہے تو اب بہ وجہ اس کے کہ قانونِ تشبیہ سے خارج ہو گیا، مباح ہوگا، تو باوجود اس تفاوت کے کوٹ پتلون کو نصابِ تعلیم پر کس طرح قیاس کرنا صحیح ہے۔

گیارہویں شبے کا جواب: اور وہ کون سی بات ہوگی جس کو علماء دس برس پہلے حرام بتلاتے تھے، اور اب اس کے جواز پر فتویٰ دیے جاتے ہیں، اگر وہ ذرائع میں سے ہے تو اس کی تبدیل کا قاعدہ ابھی معلوم ہو چکا ہے، اور اگر وہ مقاصد میں سے ہے تو اس میں ایسی تبدیل کوئی نہیں کر سکتا، اور اگر کسی نے ایسا کیا ہو، اس کی غلطی ہے، کسی کی غلطی سے قواعدِ شرعیہ نہیں بدل سکتے، عجب نہیں کہ تعلیمِ انگریزی اس سے مراد ہو تو جان لینا چاہیے کہ اس کو جس نے ممنوع کہا تھا یا اب بھی کہہ رہا ہے، نہ صرف زبان کی وجہ سے، بلکہ جو مفاسد اس کے ساتھ فی الحال مقرون ہوتے ہیں، یا آئندہ چل کر ہو جاتے ہیں، سو واقع میں ان مفاسد کو حرام کہنا مقصود ہے، سو وہ اب کون عالم ہوگا جس نے ان مفاسد کے جواز پر فتویٰ دے دیا ہوگا۔

بارہویں شبے کا جواب: اس کے بعد علماء پر گوشہ نشینی کا الزام لگایا۔ عزیزِ من! آپ کو خبر نہیں جس پیغمبر (دوحی فداہ) کا ہم کلمہ پڑھ رہے ہیں، اور آپ کی تصدیق و محبت کو جزو ایمان سمجھتے ہیں اور واقع میں یہی ہے آپ نے اس زمانے کی علامات بیان فرما کر بڑی تاکید اور زور سے مشورہ دیا ہے کہ گوشے میں پڑ کر، بلکہ جنگل میں کسی درخت کی جڑ دانت سے پکڑ کر اپنی جان دے دو۔ اور فرمایا ہے کہ:

”وہ ایسا زمانہ ہوگا جس میں صبح کو مسلمان، شام کو کافر، اور صبح کو کافر، شام کو مسلمان“

یہ حال ہو جاوے گا۔ اور فرمایا کہ:

”جب تم دیکھو کہ ہر شخص اپنی حرص کی اطاعت کرتا ہے، اور خواہش نفسانی کی پیروی کرتا ہے، اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتا ہے، اور ہر شخص اپنی رائے کو پسند کرتا ہے۔ تو بس تم اس وقت اپنا دین سنبھالو، اور عوام سے تعرض مت کرو۔“

عزیز من! ان علامات سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ وہ زمانہ یہی ہے، پھر علما نے کیا برا کیا جو گوشہ اختیار کیا۔

جو لوگ گوشوں سے نکل نکل کر ان فتنوں میں گھستے ہیں اگر اللہ تعالیٰ نے ان کو قوت و ولایت عنایت فرمائی ہے تب تو خیر وہ سلامت رہتے ہیں، ورنہ اکثر لوگ دوسروں کی اصلاح میں خود بگڑ جاتے ہیں، جس طرح کوئی جلتی آگ میں کودے کہ دوسروں کو نکالوں گا، کچھ تعجب نہیں کہ خود ہی جل جاوے، اور بڑی وجہ اس کی یہی ہے کہ جن کی اصلاح کرتا ہے وہ خود اپنی اصلاح نہیں چاہتے، اس واسطے ادھر اثر نہیں ہوتا، اور یہ شخص بعض اوقات بہ امید اصلاح ان کی ساتھ مداہنت و نرمی سے پیش آتا ہے، اور ان کے اقوال و افعال پر چشم پوشی کرتا ہے، شدہ شدہ خود اس کا دل ظلمانی ہو جاتا ہے، چنانچہ بارہا اس کا مشاہدہ ہوتا ہے۔

پس جس حالت میں دنیا پرستوں کی یہ کیفیت ہے کہ علما کو اپنے رنگ میں ملانا چاہتے ہیں، اور خود ان کے رنگ میں نہیں آنا چاہتے، تو بتلاؤ کہ عبث تضحیٰ اوقات و آوارہ گردی سے کیا نفع؟ بس اپنا ہی دین بچ جاوے تو غنیمت ہے، البتہ جو شخص خود درخواست اصلاح کی کرے، اس کی اصلاح کے لیے سب حاضر ہیں، جب تک توقع اصلاح کی باقی رہے، اور جب مایوسی ہو جاوے اس وقت بجائے وعظ و نصیحت کے حق تعالیٰ سے دعا و التجاہدایت کی کی جاتی ہے۔

تیرہویں شبے کا جواب: اس کے بعد تین اجزا دین کے لکھے ہیں: عقائد و عبادات و معاملات، اور دو چیزیں رہ گئی ہیں، آداب معاشرت و اصلاح نفس، خیر یہ سب چیزیں واقع میں اجزائے دین ہیں، مگر اس کے بعد جو لکھا ہے کہ اعتقادات کا کوئی نصاب نہیں، خدا جانے! اعتقادات

کے کیا معنی سمجھ لیے ہیں، جو اس کے نصاب کی نفی کر دی، اعتقادات چند و محدود چیزوں کی تصدیق کا نام ہے تو وہ سب چیزیں مفصل طور پر جدا گانہ کتب میں مدون و مجتمع ہیں، اور ہر دعوے پر دلائل قائم ہیں، یہ خود مستقل علم ہے، عبادات و معاملات کے تابع نہیں، جیسا مخاطب عزیز نے لکھا ہے۔ غرض! یہ جزو فہرست اجزا سے نہ گھٹ سکا، جس سے دینیات کا اختصار ثابت کرنا مقصود تھا، بلکہ یہ جزو سب اجزا سے بڑھ کر مہتمم بالشان ہے، اور اس میں بڑے بڑے عقلا کو لغزشیں ہوئی ہیں، اور اسی جزو کے اندر اختلاف بے جا کرنے سے بہتر فرقے گمراہ پیدا ہو گئے، جن میں سے اس وقت ہندوستان میں معتزلیوں کی ترقی ہے، اور اکثر تصانیف و لیکچر اسی مذہب اعتزال سے مملو و مشحون ہیں، جن سے ہزاروں تباہ ہوتے چلے جاتے ہیں، بھلا! اتنی بڑی چیز کو کسی طرح نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔

دوسرا حصہ عبادات کا ہے، جس میں آگے کلام آتا ہے، یہ بھی بہت بڑا حصہ ہے، تیسرا حصہ معاملات کا ہے، اس کو مخاطب عزیز نے تابع سلطنت قرار دے کر اس کی بھی صفائی کر دی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ معاملات کے جزو دین ہونے کے معنی نہیں سمجھے، معاملات کا واقع ہونا جزو دین نہیں، بلکہ واقع ہونے کے وقت صحیح و مطابق قواعد شرع کے ہونا یہ جزو دین ہے، اس میں سلطنت ہو یا نہ ہو، جب کوئی معاملہ مطابق شرع کے ہوگا صحیح ہوگا، اگر مخالف ہوگا فاسد ہوگا، یہ دونوں شرعی مسئلے ہر حال میں صحیح ہیں، اس میں سلطنت و مسکنت دونوں مساوی ہیں۔

آگے جو لکھا ہے کہ زنا سے سنگ سار نہیں ہوتے، چوری سے ہاتھ نہیں کٹتے، اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ معاملات خارج دین ہو گئے، یا جو کچھ اب ہو رہا ہے یہ سب جائز ہے، اس کا جو حکم شرعی تھا کہ رجم قطعید واجب ہے، وہ اب بھی بحال محفوظ ہے، خواہ قدرت نہ ہونے کی وجہ سے اس پر مسلمان عمل نہ کر سکیں، اس میں عاصی ہوں یا معذور ہوں یہ دوسری بحث ہے، اس سے علم معاملات کا واجب التحصیل نہ ہونا کس طرح لازم آیا؟ علم دین کی تکمیل کے لیے تو اب بھی اس کے مسائل کا معلوم کرنا واجب و فرض ہے، اگر یہ شبہ ہو کہ پھر اس کا نفع کیا؟ سو نفع اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا علم صحیح ہو جاوے، یہ نہ سمجھے کہ اس میں سزائے جرمانہ و جیل کافی ہے۔

اس کے بعد جو صورت فرض کی ہے، وہ ذرا نازک ہے، مگر اس میں بھی کلام کرنا چاہتا ہوں۔ زنا کی نالاش ایک دعویٰ ہے، اور عند الحاکم اس دعویٰ کے لیے گواہ کی ضرورت ہے، اور گواہ ہونے چاہئیں چار، اور جو جو اس کی شرائط کتبِ دینیہ میں مذکور ہیں وہ سب مجتمع ہونا چاہیے، پھر خود اس کے صریح طور پر دیکھنے سے بھی احکام کا بھی فرق ہو جاتا ہے، اور اس عورت کی زوجہ و خواہر و مادر ہونے کی اعتبار سے بھی اختلافِ احکام ہو جاتا ہے۔

میں سب کی تفصیل لکھتا، مگر بہ خوفِ تطویل سب کو حذف کر کے اتنا لکھنا کافی سمجھتا ہوں کہ فی الواقع جن صورتوں میں شریعت نے دعوے کی اجازت نہیں دی، دعویٰ کرنا حرام اور سخت معصیت ہے، اور اگر دعویٰ کیا، بلاشک یہ شخص معین ہوگا حکم مخالفِ شرع کا۔ رہا یہ شبہ کہ پھر کیا کرے؟ کیا خاموش ہو کر بیٹھ رہے؟ میں پوچھتا ہوں کہ اگر بالفرض اس کو کوئی گواہ معاینے کا میسر نہ ہو، اور کوئی شخص جھوٹی گواہی پر رضامند نہ ہو، تو اس وقت میں پوچھتا ہوں کہ یہ شخص کیا کرے؟ جو اس سوال کا جواب ہے، وہی عزیز مخاطب کے سوال کا جواب ہے، اور جس صورت میں دعویٰ کرنا جائز ہو بے شک دعویٰ کرے۔

رہا یہ امر کہ حکم قانونی خلاف حکم شرع ہے، اور یہ شخص اس کا معین ہے، سو جو سزا اس میں قانون ہے وہ شرعاً تعزیر ہے، اور جو سزائے شرعی ہے وہ حد ہے، اور تعزیر بہ نسبت حد کے خفیف ہے، سو جو شخص اس مجبوری سے کہ اس کا پورا حق نہ ملے گا اپنا پورا حق چھوڑ کر جزو حق کا دعویٰ کرے، اور وہ اس کو دیا جاوے، تو اس مدعی کو کیوں گناہ ہوگا؟ اس نے کون سی مخالفت شریعت کی کی؟ جس شخص کے ہزار روپے کسی کے ذمہ واجب ہوں، مگر پانسوی تو میعاد گزر گئی، اس لیے اس کے وصول سے مایوسی ہے، پانسو تازہ قرض تھا، اس کی ڈگری ہوگئی، تو اس صورت

صریح نہ دیکھنے میں دعویٰ زنا کا جائز نہیں، البتہ دعویٰ اختلاط و ارتباط کا ہوگا، اور اس کی سزا تعزیر ہے، جس میں سزائے قید و جرمانہ و جیل وغیرہ سب داخل ہیں، اور صریح دیکھنے میں جب کہ گواہ نہ ہوں اگر اپنی بی بی یا محرم شرعی کو دیکھے قتل جائز ہے، مگر دعویٰ ناجائز، اور اگر بی بی کی نسبت دعویٰ کرے گا تو لعان لازم آوے گا، یہاں لعان ممکن نہ ہوگا، دعویٰ مطلق جائز نہ ہوگا، اور دوسروں کو دیکھے تو نہ دعویٰ جائز نہ قتل وغیرہ جائز، البتہ بشرطِ قدرت مناسب تشدد یا فہمائش و نصیحت اس کا حق ہے۔

میں حاکم پر جو کچھ بھی الزام ہو مگر اس شخص پر کوئی معصیت نہیں، نہ اس نے کوئی مخالفت شرع کی، نہ مخالفت کی اعانت کی، مگر قطع نظر اس سب امور کے یہ علم دینیات سے خارج کیوں کر دیا جاوے، اگر تمام جہان بد پر ہیزی کرنے لگے تو علم طب کا ایک حصہ اس بنا پر خارج کر دینا چاہیے کہ اس کے موافق کوئی عمل تو کرنا نہیں پھر کیا فائدہ؟

رہا یہ سوال کہ طالب علموں کو ان جرائم کی سزائے شرعی پڑھانے سے کیا فائدہ؟ اس کا ایک فائدہ تو اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ بدون تعلم و تعلیم کے بقائے علم ممکن نہیں، اگر یہ سلسلہ منقطع ہو جاوے تو قطعاً اس جزو دین کا علم مفقود ہو جاوے، پھر اگر کسی وقت اس کی ضرورت پڑے تو بتلانے والے کہاں سے آئیں گے؟ اور اگر ایسا ہی حذف کرنا ہے تو سب سے اول قرآن مجید میں اختصار کرنا چاہیے کہ سب علوم کی جڑ وہی ہے، کیوں کہ جب ان احکام پر عمل نہیں ہوتا تو پھر ان آیات سے کیا فائدہ، پھر خدا نخواستہ اگر کسی موقع پر نماز روزے سے ممانعت ہو جاوے تو وہ آیتیں بھی کم کر دی جاویں کہ یہ سب بے فائدہ ہیں، پھر نعوذ باللہ اگر مسلمان رہنے کی اجازت نہ رہے تو وہ آیتیں بھی نکال دی جاویں کہ یہ بھی بے فائدہ ہے، غرض! اس طرح تو سارا اسلام اور قرآن سب بے کار ٹھہرتا ہے، الہی تو بہ۔

اس کے بعد جو تنگ ہو کر مسلمانوں کو دعائے خیر دی ہے کہ اللہ میاں اس جہان سے ان کو اٹھالیں تو ان کی حجات ہو، عزیز من! آپ نے تو یہ طعن سے لکھا ہے، مگر اتفاقی بات ہے کہ قلم سے سچا مضمون نکل گیا۔ واقع میں اس وقت اسلام خالص پر قائم رہنا اس قدر مشکل ہے، جیسا پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

”ایسے زمانے میں اسلام پر قائم رہنا اس قدر دشوار ہوگا جیسے چنگاری کو مٹھی کے اندر بند کرنا۔“

اور اس لیے ارشاد فرمایا ہے کہ:

”ایسے آشوب کے زمانے میں جو شخص دین پر عمل کرے گا اس کو پچاس صحابی کے برابر اجر ملے گا۔“

اور اس میں یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ:

”آج وہ زمانہ ہے کہ ظاہر زمین بطن زمین سے بہتر ہے، یعنی حیات، اور ایک وقت آوے گا کہ

بطن زمین ظاہر زمین سے بہتر ہوگا، یعنی موت۔

کوئی شک نہیں اس فتنے کے زمانے میں اگر کوئی شخص اپنا دین لبِ گورتک سلامت لے جاوے اس نے بڑا کام کیا۔ یا الہی! مدد فرما، ایمان پر خاتمہ کچھو۔

اس کے بعد چھوٹے معاملات کو اردو کی کتابوں میں مفید اور عبادت کے باب کو نہایت مختصر کیا گیا ہے، جس طرح مخاطبِ عزیز نے علما پر بے خبری واقعات دنیا کا حکم لگایا ہے، اس مضمون سے مخاطبِ عزیز پر بے خبری واقعات دینیہ کا حکم لگایا جانا صحیح ہے۔ عزیز من! دین پر عمل کرنے والوں کی عبادات و معاملات میں جوئی نئی صورتیں روزانہ پیش آتی ہیں ان کا احصا و شمار کرنے کا قصد کیا جاوے ممکن نہیں، اور ہر صورت کے متعلق جداگانہ حکم، جب صورتیں خارج از شمار ہیں تو ان کے احکام اس قدر مختصر کیوں کر ہو سکتے ہیں؟ اس کی تصدیق کے لیے ایک ہفتہ یا ایک ماہ کسی فتویٰ نویس عالم کے خطوط کو دیکھا جاوے، ممکن ہے کہ اس میں بعض فضول سوال بھی ہوں، ان کو متہا کر کے ضروری سوالات جو روزمرہ پیش آتے ہیں، منتخب کر کے ان ہی اردو کی کتابوں اور قرآن مجید کے رکوعِ صوم میں ان کے احکام ڈھونڈے جاویں، تب اس دعویٰ کی صحت یا غلطی معلوم ہو، اور یوں بلا تخریب و مشاہدہ جو کچھ کہا جاوے قابل التفات نہیں۔

آلِ عزیز نے دس برس پر تعجب کیا، جس کا نام کمالِ علمِ دین ہے وہ تو پچاس برس میں بھی خاطر خواہ میسر نہیں ہوتا، میری اس قدر عمر اس خدمت میں گزری ہے، مگر اب تک یہ مسئلہ مجھ کو معلوم نہیں، اور نہ کسی کتاب میں اب تک مجھ کو ملا، اور روزمرہ واقع ہوتا ہے کہ مسافر امام کے سلام کے بعد جب مقتدی کھڑا ہو کر نماز پوری کرے تو یہ تو معلوم ہے کہ فاتحہ نہیں پڑھتا مگر قوم میں سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ يٰ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ کہے یا نہ کہے، بھلا کسی اردو کی کتاب یا قرآن مجید کے کسی رکوع میں سے یہ مسئلہ نکال تو دیا جاوے، اور اگر رائے سے جواب دیا جاوے تو ہر شخص کی رائے معتبر نہیں، جس شخص نے تمام اصول و فروع و دلائل و نظائر کو احاطہ کیا ہو اسی کی رائے بھی قابل اعتبار ہو سکتی ہے، سو یہ احاطہ سا لہا سال میں جا کر نصیب ہوتا ہے، اب بتلاؤ کہ دس برس زائد ہیں یا کم۔

چودھویں شبے کا جواب: اس کے بعد جو مسجد کا رستہ لینے والوں پر عیب لگایا ہے، سو جس نے مسجد تحصیل مال کے لیے سنبھالی، بہت بُرا کیا، شریعت اس کو بھی لاتاڑتی ہے، اور اگر عبادت و علم کے لیے ایسا کیا، اور رزق کو اللہ تعالیٰ کے ذمے سمجھا تو کیا برائی کی؟ حضور اقدس ﷺ نے بعد نبوت اگر مسجد نشینی نہیں کی تو کیا کیا؟ اور صحابہ سے ہدایا اور تحائف کیا قبول نہیں فرمائے؟ اور کیا آپ کو قرآن مجید میں یہ نہیں فرمایا:

﴿وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۖ لَا نَسْأَلُكَ رِزْقًا ۚ نَحْنُ نَزِقُكَ﴾ الآية

پھر اس میں عیب کیا ہوا، ساری بات یہ ہے کہ جو شخص ظاہراً ٹیپ ٹاپ سے رہتا ہے اس کے عیوب بھی موجب تحقیر نہیں ہوتے۔ اور جو شخص مسکنت غربت سے رہتا ہے اس کے ہنر بھی باعث تذلیل ہوتے ہیں۔ قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ مسجد نشینوں کے فتوحات جو من جانب اللہ عنایت ہوتے ہیں جس قدر لوگوں کی نظر میں حقیر و ذلیل ہیں، کیا کسی بڑے عہدے دار کی رشوت کی کمائی اس قدر نظر میں حقیر اور ذلیل ہے؟ ہرگز نہیں، اور یہی وجہ ہے کہ اہل ثروت کا کفر و فسق نظر میں نہیں چھتا، اور غریب مسلمانوں کی دین داری و اطاعت خداوندی بے قدری کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے، اناللہ۔

پندرہویں شبے کا جواب: اس کے بعد کوٹ پتلون کی حکایت مذکور ہے، اور ٹوپی کی تبدیلی کو قومی لباس بن جانے کے لیے کافی کہا گیا ہے۔ جس سے سخت حیرت ہے، اگر کوئی شخص زنانہ پائے جامہ، زنانہ کرتہ، زنانہ دوپٹہ پہنے، مگر سر پر امتیاز کے لیے ٹوپی بھی اوڑھ لے، کیا کوئی عاقل اس شخص کے لباس کو صرف ٹوپی کی وجہ سے مردانہ لباس کہہ سکتا ہے، بلکہ اگر تمام تر لباس مردانہ ہو، مگر ایک کپڑا صرف زنانہ ہو، جب بھی لوگ اس کو نہیں گے، حالاں کہ غالب حصہ مردانہ لباس ہے، پھر اس کے عکس میں تو کیا ہونا چاہیے۔

اور یہ جو پیشین گوئی کی ہے کہ دس برس کے بعد منکرین کو بھی پہننا پڑے گا، سوا دل تو بلا دلیل یہ پیشین گوئی مقبول نہیں، پھر اگر خدا نخواستہ ایسا ہی ہوا تو اس وقت یوں کہو کہ یہ لباس

بہت عام ہوگا، اور جو خصوصیت غیر اقوام کے ساتھ لباس کو ہے جس خصوصیت کی وجہ سے تہبہ کا حکم کیا جاتا ہے، یہ خصوصیت جاتی رہے گی، جب خصوصیت گئی تو تہبہ بھی گیا، پھر اگر مانع بھی پہننے لگے تو حرج کیا ہوگا، لیکن جب تک خصوصیت باقی ہے، اور تہبہ حاصل ہے، حکم شرعی کس طرح اس پر متوجہ نہ ہوگا؟

اس کے بعد سواری میں اس لباس کی ضرورت لکھی ہے، سو میں اگر گھوڑے کی سواری جانتا تب تو اس کا عملی جواب دیتا، مگر افسوس کہ اب اس سے قاصر ہوں، لیکن اب بھی کئی شافی جواب رکھتا ہوں۔

اول: آں عزیز مدت سے گھوڑے پر خوب سوار ہوتے ہیں۔

دوم: بہت لوگ اسپ سوار دیکھے جو پچاس پچاس میل کا دورہ کرتے تھے، مگر یہ لباس ان کے پاس نہیں دیکھا، وہ کیوں کر سوار ہوتے ہیں؟

سوم: اگر یہ ہندوستانی کپڑا سواری میں جلد پھٹ جاتا ہے تو خدا کا فضل ہے، ایک پائے جامہ کی جگہ چار پائے جامہ بنا لیے جاویں۔

چہارم: اگر کسی کپڑے کا پائے جامہ بنایا جاوے تو یہ بھی ممکن ہے کہ بشکل پائے جامہ ہندوستانی کے بنایا جاوے، ٹخنے بھی کھلے رہیں، پتلون بنانے کی کیا حاجت ہے؟

پنجم: اگر مان بھی لیا جاوے کہ بدون اس کے سواری میں تکلیف ہوتی ہے تو غایت سے غایت صرف ایک چیز کی ضرورت ثابت ہوئی بشرطے کہ ٹخنا ضرور کھلا ہو، وہ بھی ایک خاص وقت میں، اس کے علاوہ جو بہت سی چیزیں خلاف شرع کمرے میں موجود ہیں، چنناں چہ تصویر و باجہ وغیرہ اس کی کون ضرورت ہے؟ اسی طرح غیر وقت سواری میں اس لباس کی کیا حاجت ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ گشت سے فارغ ہو کر اس کو نکال دیا جاوے؟ اور پہننے کے وقت میں بھی اس کی کراہت و نفرت دل میں رکھی جاوے، اس طرح ضرورت بھی رفع ہوگئی، اور زیادہ مخالفت بھی شریعت کی نہ ہوئی، اس لیے کہ الضرورات تبيح المحظورات^۱ خود مسئلہ شرعیہ ہے، مگر

^۱ ضرورتیں ممنوع چیزوں کو مباح کر دیتی ہیں۔

اس کے ساتھ الضروری یتقدّر بقدر الضرورة بھی حکم ہے، یعنی ضرورت سے جس چیز کی اجازت ہوئی ہے وہ حد ضرورت تک جائز ہوگی، مثلاً ضرورت مجوٹ فیہا میں اگر صرف پتلون سے ضرورت رفع ہو جاوے تو کوٹ جائز نہ ہوگا، جب صرف سواری کے وقت احتیاج ہے غیر وقت میں جائز نہ ہوگا، جب صرف استعمال بدنی کی حاجت ہے دل سے اس کو پسند کرنا جائز نہ ہوگا۔ دوائی تلخ جو بہ ضرورت استعمال کی جاتی ہے، کیا اس سے کوئی دل سے خوش ہوتا ہے؟ اگر وہ مکروہ طبعی ہے تو یہ مکروہ شرعی ہے، پھر اس میں کراہت و نفرت نہ ہونے کی کیا وجہ؟ اس طرح اگر استعمال ہو تو اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ غفو ہو جاوے۔

اور اس میں بھی بدون اس بات کے کہے رہا جاتا نہیں کہ اگر حاکم ضلع بالمشافہہ کسی خاص شخص کو بلا کر قطعاً کوٹ پتلون سے ممانعت کر دے اس وقت یہ عذر جو بمقابلہ حکم شرعی کے پیش کیے ہیں حاکم مذکور کے رو برو پیش کرنے کی مجال ہو سکتی ہے، بھلا! حاکم حقیقی کے احکام کو اقل درجہ حاکم مجازی کے برابر تو سمجھنا چاہیے۔

سولہویں شبے کا جواب: اس کے بعد جمع بین الصلا تین کا مسئلہ ذکر کیا ہے۔ عزیز من! اسی لیے علما کوشش کرتے ہیں کہ دینیات کا علم کافی ہونا ضرور ہے، ورنہ علم ناتمام سے خود روائی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ تو تحقیق کرنا چاہیے کون موقع پر فتویٰ دیا ہے؟ اور وہ موقع آں عزیز کو پیش آتا ہے یا نہیں؟ بتلاؤ: یہ قیاس اور رائے محض نہیں تو کیا ہے؟ افسوس ہے کہ کسی حاکم کے قانون میں بلا تحقیق اس طرح یوں ہی النکل قیاس کر کے کوئی عمل کر سکتا ہے، کوئی لفظ بھی مشتبہ ہوتا ہے تو اس کو جگہ جگہ دکھلاتے پھرتے ہیں کہ اس کا کیا مطلب ہے، اور اگر ہر جگہ جدا مطلب معلوم ہو تو جس میں سب سے زیادہ احتیاط ہو اس پر عمل کرتے ہیں۔ اور احکام خداوندی میں ایسی بے باکی کہ فتویٰ دوسرے موقع کا، اور اس کو جاری کر لیا اور جگہ، خیال کرنے کی بات ہے کہ بے پروائی کی بات ہے یا نہیں۔

اور ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ نے جو محدث ہیں حدیث نقل کر دی۔ محدث کا کام نقل کر دینا ہے، اس کا سمجھنا اور احکام میں تطبیق دینا یہ کام فقہاء و مجتہدین کا ہے، سو تمام امت کا اس پر اجماع ہے

(اور اجماعِ حجتِ قطعیہ ہے مثل قرآن وحدیث کے) کہ بلا سفر ومرض جمع کرنا حرام ہے، اور نماز صحیح نہیں ہوگی، اور سفر ومرض میں بھی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جائز نہیں، اور جو نظیر میں نے اوپر قانونِ حکومت پر عمل کرنے کی لکھی ہے وہ اس مسئلہ میں امام صاحب کے قول کو ترجیح دینے کے لیے کافی ہے، اور جب کہ سفر ومرض میں بھی نہ ہو تو یہ جرات کس طرح ہو سکتی ہے، خدا کے لیے اس کو ترک کرنا چاہیے، اس طرح نماز بالکل ذمے رہتی ہے، اور جتنی نمازیں اس قسم کی پڑھی ہیں تخمینہ کر کے ان کی قضا کرنا چاہیے۔

اس کے بعد معذرت نسبتِ اظہارِ شبہات کے لکھی ہے، یہ آں عزیز کی صلاحیت وسعادت مندری ہے، ورنہ مجھ میں نہ طبابت کی لیاقت ہے نہ علاج کی قابلیت، مگر محض خیر خواہی و دل سوزی سے جو کچھ بھی فی البدیہہ آیا میں نے لکھ دیا۔ اگر اب بھی کوئی شبہ ہو تو بے تکلف پیش کیا جاوے، مگر جو بات ہو مربوط ہو، غیر مربوط مضامین سے کلام، پھر اس کا جواب بہت طویل ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہوئی اس تقریر کے بڑھ جانے کی کہ اکثر مضامین مدعائے اصلی سے محض زائد تھے، اور یوں جیسے مضامین ہوں گے ان شاء اللہ تعالیٰ برابر جواب دوں گا، اور جو مجھ کو معلوم نہ ہوگا اور کسی عالم کا پتہ بتلا دوں گا، اگر آں عزیز کو طلبِ حق دل سے ہوگی اور اپنی رائے میں احتمالِ غلطی کا ہوگا، تو ان شاء اللہ تعالیٰ حق واضح ہو جاوے گا، اور میں نے صرف یہی جواب نہیں لکھا، بلکہ برابر دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ غلطی سے نجات بخش کر ہدایتِ حق کی فرماوے، اللہ تعالیٰ قبول فرماویں۔

اس کے بعد جو نوکری کے متعلق استفسار کیا ہے، عزیز من! وہ ایک فرع ہے، مقدم درستی اصول کی ہے، اس لیے میں نہ ابھی اس نوکری کو جائز کہوں نہ ناجائز، بعد تشفی واصلاحِ اصول کے ان شاء اللہ تعالیٰ جو کچھ اس میں میری تحقیق ہے ظاہر کروں گا، چندے مجھ کو مہلت دی جاوے، اور امورِ اختلافیہ کا فیصلہ کر لیا جاوے۔

سترہویں شبے کا جواب: سب کے آخر میں جو شبہ خصوصیت بعثتِ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطے اصلاحِ عرب کے لکھا ہے، اس سے روٹنے کھڑے ہو گئے (یہ نہ سمجھیں کہ بس یہ جواب ہو گیا، جواب تو آگے لکھتا ہوں، مگر یہ اظہار ہے ایک طبعی حالت کا) عزیز من! یہ عقیدہ یہود کا

تھا، جس کی تردید قرآن وحدیث میں صاف صاف مذکور ہے، اور حضور کا عامہ خلاق کی طرف مبعوث ہونا منصوص ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا﴾^۱

اور ارشاد ہوا ہے:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾^۲

اور حضور نے ارشاد فرمایا ہے:

بعثت إلى الخلق كافة^۳

اور حضور نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

”جو شخص میری خبر سن لے خواہ یہودی ہو یا نصرانی، پھر وہ ایمان نہ لاوے، ضرور دوزخی ہوگا“۔

یہ تو قولی حجت ہے۔ اب عملی دلیل سنیے! حضور نے قیصر روم، کسریٰ فارس و نجاشی حبشہ و متوقس مصر کے پاس فرمان مبارک اسلام لانے کے لیے اور در صورت مسلمان نہ ہونے کے اُن پر گناہ و وبال کے لکھ لکھ کر بھیجے، اگر آپ کی بعثت خاص ہوتی، آپ ایسا امر کیوں فرماتے، اب نصوص کے بعد اس میں کیا تردد ہو سکتا ہے کہ آپ جمیع خلق کی طرف مبعوث ہوئے۔

اب جو امور مخاطب عزیز کے اس خیال کے اسباب ہیں ان کی نسبت لکھتا ہوں۔

امر اول: و موجب شبہ: اس زمانے کے عرب اپنی زبان میں فصیح و بلیغ تھے، ان کے لیے قرآن زبان عربی میں نازل ہوا، جس سے ان کو یقین ہوا کہ وہ کلام بشر نہیں۔ فقط۔

عزیز من! اول تو علاوہ کلام اللہ حضور کے معجزات ہزاروں ہیں، جن کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے، اگر کلام اللہ کو نہ سمجھا کوئی حرج نہیں۔ پھر یہ کہ جب ایک قوم نے بعد ہزاروں مخالفت کے آپ کو مان لیا۔ دوسروں کے لیے صرف یہ امر کافی ہے کہ جو لوگ اس فن کے ماہر ہیں اور وہ مقابلے سے عاجز ہو گئے، ضرور یہ کلام معجزہ ہے، پس معجزہ قرآنی بایں معنی عام ہو گیا۔

امر دوم: موجب شبہ: تمام عمر جناب رسول خدا ﷺ اس قوم میں رہے، اور جب ان کی تکمیل

۱۔ سورہ سبأ: ۲۸۔ ۲۔ سورہ الانبیاء: ۱۰۷۔ ۳۔ میں تمام مخلوق کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

ہوگئی وقات فرمائی۔ فقط۔

میں کہتا ہوں: یہ کیا ضرور ہے کہ جو شخص جماعت کی اصلاح کے لیے بھیجا جاوے وہ ہر شخص کے پاس جایا کرے، ورنہ اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ عرب میں بھی جن بستیوں میں آپ تشریف نہیں لے گئے وہ بھی آپ کے دائرہ نبوت سے خارج ہوں۔ اگر کہا جاوے کہ ملک عرب سب ایک ملک ہے، ہم کہیں گے: سب زمین عالم کی ایک زمین ہے، اگر آپ ہر جگہ تشریف نہیں لے گئے تو آپ کے فرمان مبارک تو جا بجا پہنچے، جیسا کہ حدیثوں میں آیا ہے، اور تکمیل عرب کے بعد وفات فرمانا یہ بھی کوئی حجت نہیں، اگر کوئی حکیم مصلح کسی خاص بستی کی اصلاح کے لیے بھیجا جاوے، اور پچاس، سو لائق آدمیوں کی تکمیل کر کے اور باقیوں کی تکمیل ان کے حوالہ کر کے واپس چلا جاوے، کیا یوں کہا جاوے گا کہ بس جن کی تکمیل ہوئی ان ہی لوگوں کی اصلاح مقصود ہے؟ یا یوں کہیں گے کہ اصلاح سب کی مد نظر تھی، مگر بعض کی تکمیل سے سلسلہ تکمیل کا جاری ہو گیا، اس لیے اب رہنے کی ضرورت نہ ہوئی۔

امر سوم: موجب شہ: دیگر اقوام نے آپ کے قرآن کو اس بنیاد پر نہ مانا جس پر عرب نے مانا تھا، بلکہ ان لوگوں کو عرب نے بزورِ شمشیر زیر کیا، اور ان کو زبردستی مسلمان کیا الخ۔

میں کہتا ہوں: قرآن مجید کا معجزہ عام ہونا اوپر ثابت ہو چکا ہے، سوجب حق واضح ہو گیا اس کی مخالفت عقلاً کسی کو جائز نہ ہوئی، اس لیے قانون اسلام نے مزاحم و مخالف کی قوت کو گوارا نہ کیا۔ اطاعت کی یہی دو صورتیں ہیں: اسلام یا جزیہ، یہ خود قانون اسلامی ہے، صحابہ کی ایجاد نہیں، قرآن وحدیث کے ماہر پر یہ امر مخفی نہیں، اور یہ امر گو ہمارے دعوے میں مضمر نہیں، مگر بالکل خلاف واقع ہے کہ زبردستی مسلمان کیا، صحابہ اول تبلیغ کرتے تھے، اور رفعِ شہادت و مناظرے کی اجازت دیتے تھے، اور وضوحِ حق کے بعد ترکِ مخالفت میں زبردستی بھی جو عقلاً جائز ہے، چنانچہ بعد ثبوتِ حکومت گورنمنٹ کے باغی کو سزا دینا بالکل درست و موافق عقل کے ہے، اور ترکِ مخالفت کی وہی دو صورتیں ہیں جو اوپر مذکور ہوئیں۔

امر چہارم: موجب شہ: بہت لوگوں کو آپ کے پیغمبر ہونے کی خبر نہیں ہوئی۔ فقط۔

میں کہتا ہوں: عمومِ بعثت کے لیے یہ ضرور نہیں کہ سب کو خبر ہو جاوے، بلکہ رحمتِ خداوندی سے اس میں یہ وسعت ہے کہ جس جس کو خبر ہوتی جاوے قبول کرتے جاویں، اور جس کو خبر نہ ہو وہ معذور ہے۔

امرِ پنجم: موجبِ شبہ: ہندوستان و امریکہ و افریقہ کی ہدایت کیا ہوئی فقط۔

اس کا جواب امرِ شبہ چہارم میں گزر چکا، میرا ارادہ اس میں زیادہ لکھنے کا تھا، مگر چوں کہ عمومِ بعثت کے دلائل بہت قطعی و صاف ہیں، اور شبہات مذکورہ نہایت ضعیف۔ اس لیے اختصار کیا گیا، اگر خدا نخواستہ! یہ کافی نہ ہوں تو اس سے زیادہ لکھنے کو تیار ہوں۔

خط نصیحت آمیز جس کا ذکر خطبے میں ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
بخدمت عالی مرتبت مجمع اخلاق و الطاف سلمہم اللہ تعالیٰ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

ہر چند کہ مجھ کو آپ سے صوری نیاز حاصل نہیں، مگر آپ کے اخلاق و اوصاف سن کر غائبانہ تعلق ہے، جس نے اس عرض کی جرات دلائی، میری گم نامی و ناشناسائی پر نظر نہ فرمائیں، بلکہ انظروا الی ما قال، ولا تنظروا الی من قال کو پیش نظر رکھیے۔ اب بنام خدا شروع کرتا ہوں۔

مگر ما! جہاں تک آپ کے مساعی و تصانیف کو غور کر کے دیکھا، یوں معلوم ہوا کہ آپ کو دو چیزیں مقصود ہیں: خیر خواہی اسلام، و خیر خواہی مسلمانان، خیر خواہی اسلام نے اس پر مجبور کیا کہ جو اعتراضات مذہب اسلام پر مخالفین کے ہیں ان کے جواب دیے جائیں، اور خیر خواہی مسلمانان اس امر کا باعث ہوئی کہ مسلمان جو حنیض تنزل (پستی) میں گرے ہیں ان کو ترقی پر پہنچایا جاوے، ان دونوں مقصودوں کے مستحسن ہونے میں کسی منصف کو کلام نہیں ہو سکتا۔ مگر صرف غور طلب یہ امر ہے کہ اس کے ذرائع اور وسائل کیا چیز ہیں؟ اس کی تعین باعث اختلاف خیالات جمہور اہل اسلام ہے۔

آپ نے اسلام کے اوپر سے اعتراض دفع کرنے کی یہ صورت ٹھہرائی کہ جو تحقیقات جدیدہ ہیں ان میں کلام نہ کیا جاوے، بلکہ جس طرح بن پڑے اسلام کو اس پر منطبق کر دیا جاوے، اور منشا اس تجویز کا صرف یہ دلیل ہے کہ تحقیقات جدیدہ مطابق واقع کے ہیں، اور اسلام غیر مطابق واقع کے نہیں، دوسرے مقدمے کے تسلیم میں تو کسی مسلمان کو گنجائش نہیں رہی، پہلا مقدمہ وہ محل کلام ہے، اس کی کیا دلیل ہے کہ سب تحقیقات جدیدہ صحیح ہیں؟ تمثیلاً بعض امور کو پیش کرنا چاہتا ہوں، مثلاً: فلاسفہ کی تحقیق ہے کہ آسمان کوئی مجسم چیز نہیں، بھلا اس کے صحت پر کون دلیل قائم ہے؟ اگر یہ رنگ جو نظر آتا ہے آسمان نہ ہو اس سے آگے بہت دور موافق

حدیث صحیح کے پانچ سو برس کی مسافت پر پہلا آسمان موجود ہو، اس سے آگے اور سماوات ہوں تو کون سی دلیل عقلی قطعی کی مخالفت لازم آتی ہے؟ مثلاً: ان کی تحقیق ہے کہ اصحاب کہف اور یاجوج ماجوج اور جن موافق عقائد اسلام موجود نہیں۔ اس کی کیا دلیل ہے؟ اگر کہے کہ باوجود تلاش ملے نہیں، جن نظر نہیں آئے تو جہاں میں کسی چیز کا نہ ملنا، نظر نہ آنا دلیل اس کے عدم کی نہیں ہوتی، امریکہ کا حال پہلے معلوم نہ تھا، سیاحان ارض کو پتہ نہ لگا تھا، اور معتبر اخبار سے ثابت ہوتا ہے کہ نئے نئے حصے نکلتے آتے ہیں، تو کیا یہ مقامات اس وقت معدوم تھے؟

رہا یہ کہ جن شہروں کا نام مفسرین نے لکھا ہے وہاں نہیں ملے، تو اول حق تعالیٰ میں قدرت ہے کہ باوجود یہ کہ انھیں مقامات میں موجود ہوں پھر محجوب کر دیے جاویں، چنانچہ عنقریب بحث معجزہ میں یہ مضمون آتا ہے، اور بعد تسلیم ان مقامات میں نہ سہی، اور کہیں ہوں، نصوص کی کیوں تاویل کی جاوے؟ مثلاً: فلاسفہ جدید نے معجزات انبیاء کا انکار کیا اس وجہ سے کہ یہ خلاف فطرت ہے، اس پر کون سی شافی دلیل موجود ہے جس سے نصوص کو مصروف عن الظاہر کیا جاوے؟

رہا یہ کہ خلاف فطرت ہے اس فطرت کی ماہیت آج تک متعین نہیں ہوئی، جس سے کوئی قاعدہ منضبط ہو سکے، نہ یہ کسی دلیل یقینی سے ثابت ہوا کہ فطرت کے خلاف کیوں محال ہے، اگر فطرت کی حقیقت عادت الہی ٹھہرائے، اور دلیل استحالہ خلاف فطرت یہ ٹھہرائے کہ عادت الہی وعدہ فعلی ہے، اس کا خلاف مثل وعدہ قولی کے محال ہوگا۔

سوا اول تو ان دونوں مقدموں میں کلام ہے، کیوں کہ عادت الہی اول وعدہ نہیں، یہ امر دلیل طلب ہے، دوسرے عادت کے لیے یہی ضرور نہیں کہ ہر روز واقع ہوا کرے، بعض امور میں یوں ہی عادتاً ہو کہ گاہ گاہ واقع ہو جاتا ہو، اور معجزات اسی قبیل سے ہوں، اس سے استدلال کا جواب بھی ہو گیا۔

﴿فَطَرَتِ اللَّهُ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ﴾

اور ﴿وَلَنْ نَجِدَ لِسِنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا﴾

یہ جب ہے کہ ان آیات کے وہی معنی تسلیم کر لیے جاویں جو آپ فرماتے ہیں، اور اگر دوسری توجیہ کی جاوے جیسا کہ مفسرین محققین نے کی ہے، اور وہ توجیہ آپ کی تاویلات سے زیادہ بعید نہیں، اس وقت استدلال ہی صحیح نہیں، جو اب کی کیا حاجت ہے، دوسرے یہ کہ ریل و تار برقی اور فونو گراف اور ٹیلیفون اور فون اور خاک و بلا کیا کیا ایجاد ہوا ہے، آپ انصاف سے فرمائیے کہ اگر یہ چیزیں کسی نے نہ دیکھی ہوں، اور آپ کا قاعدہ کہ خلاف عادت محال ہے، اس کے نزدیک مسلم ہو تو وہ ان چیزوں کے وجود کا اس قاعدہ سے انکار کرے گا یا نہیں، ضرور انکار کرے گا، پس اگر وہ قاعدہ صحیح ہے تو آپ کو بھی ان چیزوں کا انکار ضروری ہے، بلکہ صانع عالم کا ماننا ضروری نہ ہوگا، اگر ان چیزوں کا وجود مسلم ہے تو قاعدہ سے دست بردار ہونا ضروری ہے۔

اگر یہ شبہ ہو کہ یہ چیزیں تو مستند (الی الاسباب) ہیں، اور معجزہ تو بلا سبب ایک فعل ہو جاتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسباب دنیاویہ اختیار یہ للعباد میں انحصار اسباب کا کسی دلیل سے ثابت ہونا چاہیے، حق تعالیٰ کی مشیت اور حکم کتنا بڑا سبب ہے، اس کے سبب ہونے میں کیا خرابی عقلی ہے؟ پس ثابت ہوا کہ انبیاء سے معجزہ ہر قسم کا صادر ہونا ممکن ہے، پھر کیوں نصوص کی تاویل کی جاوے؟

یہی حال دوسری تحقیقات جدیدہ کا ہے کہ اکثر اس میں مخدوش اور مبنی بر تخمین و تقلید ہیں، البتہ اگر کوئی دلیل عقلی ایسی ہو کہ اس کے تمام مقدمات برہانی ہوں، یا مشاہدہ صحیح ہو، جس میں احتمال غلط فہمی کا نہ ہو، اور پھر کوئی نص ظاہراً اس کے مخالف معلوم ہو، اس وقت اس نص میں تاویل مناسب ضرور ہے، مثلاً: نصوص قرآنیہ سے یہ اور وجہ وغیرہ حق تعالیٰ کے لیے ہونا ظاہراً معلوم ہوتا ہے، اور دلیل قطعی سے انقائے اجزا ثابت ہے، ان لفظوں میں البتہ تاویل کی گئی، اور تاویل میں بھی یہ شرط ہے کہ موافق قواعد عربیہ و شرعیہ ہو، ورنہ وہ تحریف ہے، آپ کی تاویلات اولاً بلا ضرورت، جیسا اوپر بیان ہوا۔ ثانیاً قواعد عربیہ کی پابندی، نہ قواعد شرعیہ کی،

پہلے علما نے بھی ملاحظہ کے جواب دیے ہیں، مگر اس طرح کہ اول ان کی تحقیقات کو منہدم کیا، اور جس تحقیق کو بالکل صحیح پایا، اس جگہ مناسب تاویل کی۔

اسی جگہ سے معلوم ہو گیا کہ آپ نے جو اکثر احادیث نبویہ کو غیر معتبر ٹھہرایا ہے اس کی بھی کوئی دلیل نہیں، اگر دلیل مخالفت دلیل عقلی ہے تو معلوم ہو چکا کہ دلیل عقلی سے مراد دلیل قطعی ہے نہ کہ دلیل وہمی، ورنہ اس دلیل عقلی کی تعیین مشکل ہو جاوے گی، پس کون بعض عقل کو اس کا معیار قرار دیں گے، کیوں کہ عقول میں تفاوتِ فاحش ہے، پھر ہر شخص کی عقلی تحقیق جدا ہوگی، اور سب کو صحیح ماننا پڑے گا، اس میں تو اجتماعِ نقیضین والتقائے ضدین لازم آوے گا، مثلاً: بطیموس اور فیثا غورس حرکت و سکون زمین و آسمان میں مختلف ہیں، افلاطون و ارسطو حدوت و قدوم ارواح میں متخالف ہیں، پھر ایک کی تحقیق تو ضرور غلط ہوگی، ہر گاہ تحقیق عقلی کی غلطی بھی ممکن ہوئی تو آپ کو کیسے وثوق ہوا کہ آپ کی عقلی دلیل ایسی صحیح ہے کہ لا بد نص میں تاویل ہی واجب ہے۔ معلوم ہوا ایسے کی عقل ان امور میں قابلِ وثوق نہیں۔ جن کی نبوت و اخبار عن الواح مسلم ہے ان کی خبر قابلِ اعتبار ہوگی، عقل کا کام اتنا ہی ہے کہ توحید و رسالت کے اصول عقلیہ میں سے ہیں سمجھ لے، آگے فروع میں زمام اختیار بدستِ حاکم حقیقی اور اس کے خلیفہٴ اعظم کو دے دیں۔

دیکھیے! جب سلطان وقت بعد تدبر و تفکر کے اپنے کسی حاکم کی معرفت کوئی قانون ملک میں جاری کرے، رعایا کو اس تحقیق کی تو ضرورت ہے کہ یہ سلطان ہے، اور فلاں شخص اس کا حاکم، تاکہ بے اصل منادی پر جو کسی نے براہِ بغاوت یا براہِ تمسخر شہر میں کر دے عمل نہ کر لیں، اور جب دونوں امر حقیق ہو گئے تو اب اس قانون میں غور کرنا کہ ہماری عقل کے خلاف تو نہیں محض ناجائز ہے، اگر ایسا کیا اور اپنی عقل کا اتباع کر کے قانون کا انکار کیا یا تاویل بعید کی تو معذور نہ ہوگا، اور اگر یہ باب مفتوح ہو تو ملک میں قوانین کا جاری ہونا موت ہو جاوے، اور بغاوت عالم گیر ہو جاوے، یہی حال حاکم حقیقی کے قوانین کا سمجھنا چاہیے، اور اگر انکار حدیث

اس بنا پر ہے کہ ان میں کسی قدر اختلاف ہے، سوائے غور فرمایا لیجیے کہ تواریخ و اخبار میں اختلاف ہوتا ہے یا نہیں، ہر گاہ اختلاف موجود ہے۔ پھر چاہیے کوئی تاریخ و خبر معتبر نہ ٹھہرے، جیسے مؤرخین و راویان اخبار کے معتبر ہونے کو دیکھ کر مان لیتے ہیں، اور اختلاف کو مفسر تسلیم نہیں سمجھتے، ایسے ہی حدیث میں رواۃ اسناد کے حالات اسماء الرجال سے تحقیق کر کے اس کے ساتھ یہی عمل درآمد کریں تو کیا حرج ہے؟

اس تقریر سے غالباً آپ کے تمام خیالات کا جو باعث ایسی تحریرات کے ہوئے جواب ہو گیا ہے۔ علاوہ اس کے ہر کارے و ہر مردے تحقیقات دینیہ میں گفتگو کرنا اور لوگوں کو کام تھا۔ آپ اس جملے سے یہ نہ سمجھیے کہ میں آپ کے علم و عقل کا منکر ہوں، یہ بات نہیں، بلکہ اصل یہ ہے کہ ہر امر میں اس شخص کی وقعت و تاثیر ہوتی ہے جس سے اس کا پہلے سے اعتبار ہو، علمائے محققین کی تحقیقات مسلمانوں میں معتبر سمجھی گئی ہیں، اور وہ لوگ اس کام کو کم و بیش کر بھی رہے ہیں، وہ اس خدمت کے لیے کافی تھے، دوسرے یہ کہ ہر شئی کے لیے ہر زمانے میں اس کے مناسب لوازم و خواص و آثار ہوتے ہیں، اول تو ہر زمانے میں نہیں تو اپنے زمانے میں تو ہم دیکھتے ہیں کہ تحقیق مسائل کے لیے اتنی چیزیں ضروری ہیں: وہ شخص عالم مشہور ہو، مثنیٰ پر بہرگار ہو، یہی شغل زیادہ ہو، لوگ اس کو دین دار و فہم سمجھتے ہوں، دنیا میں زیادہ آلودہ نہ ہو، اور جس شخص میں یہ صفات نہ ہوں اس کو اس میدان میں قدم نہ رکھنا چاہیے، کیوں کہ سعی لا طائل و جہد باطل ہے، سو جیسی حالت اس وقت آپ کی ہے ایسی حالت پر آپ کی کوئی تحقیق صحیح بھی ہوتی تب بھی سکوت فرمانا چاہیے تھا، کیوں کہ ایسی حالت میں بولنا اور بولنا بھی ایسا جو سارے جہان کے خلاف ہو بیٹھے بٹھلائے اپنے مسلمان بھائیوں میں تفرقہ ڈالنا ہے، جس کو آپ سب سے زیادہ ناپسند کرتے ہیں، اور تعجب ہے کہ اس تفرقے کے سبب عظیم پر آپ غور نہیں فرماتے۔

یہاں تک تو خیر خواہی اسلام پر معروض کیا گیا، دوسرا امر مسلمانوں کی خیر خواہی اور ان کی ترقی کی تدبیرات کرنا ہے، اس کے مستحسن ہونے میں بھی کوئی کلام نہیں کرتا۔ ہاں! اس کے متعلق جو تدابیر کی جاتی ہیں وہ البتہ غور طلب ہیں، خلاصہ تمام تر آپ کی کارروائیوں کا یہ ہے

کہ انگریزی میں اعلیٰ درجے کی لیاقت و استعداد حاصل کر کے بڑے بڑے عہدے اور حکام تک رسائی اور قوم میں وقعت حاصل کریں۔ میں اس میں زیادہ گفتگو کرنا کہ انگریزی پڑھنا بحالت کدائیہ^۱ کیسا ہے؟ اور اس کا اثر کھلی آنکھوں مذہب پر کہاں تک پڑ رہا ہے؟ نہیں چاہتا کہ اولاً اس میں بحث طویل ہے، دوسرے علما سے تحقیق ہو سکتی ہے۔

صرف اس قدر عرض کرتا ہوں کہ اول تو ترقی قومی انگریزی پڑھنے میں منحصر نہیں۔ میری رائے میں اگر ترقی و وقعت مطلوب ہے تو ترقی مالی اس کا ذریعہ ہے، اس زمانے میں دیکھا جاتا ہے کہ علم و کمالات پر کسی کی بھی نظر نہیں الا ماشاء اللہ، عوام، میں حکام میں مال دار کا اعتبار ہے، اس کی عزت ہے، اس کو خطاب و القاب ملتے ہیں، اکثر مقاصد میں کامیاب ہوتا ہے، مجسٹریٹی وغیرہ عہدے بھی مل جاتے ہیں، مشورہ حکام میں بھی شریک کیے جاتے ہیں، خواہ انگریزی ایک حرف بھی نہ جانتے ہوں، اور اگر ترقی مالی مطلوب ہے تو تجارت و صنعت سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں کہ ہر شخص ہر وقت میں پیشہ و روزگار کا محتاج ہے، تعلیم انگریزی خواں فیصدی دس جمعیت سے ہوں گے۔ اور اہل صنعت و تاجر فیصدی دس پریشان ہوں گے۔ اگر بجائے تعلیم انگریزی صنایع کی تعلیم کا اہتمام فرماتے تو قوم کو زیادہ نفع ہوتا۔

ثانیاً: اگر فرض کر لیا جاوے کہ ترقی قومی انگریزی تعلیم میں منحصر ہی ہو، سرکاری مدارس کیا کچھ کم تھے جو جناب کے مدرسے کی حاجت ہوئی؟ اگر یہ وجہ بتلائی جاوے کہ ان مدارس میں مذہبی خیالات خراب ہو جاتے ہیں اس لیے ایسے مدرسے کی ضرورت ہوئی جہاں مذہبی تعلیم بھی ہو۔ مگر ماں! سچ کہتا ہوں، اور آپ بھی دل میں جانتے ہوں گے کہ سرکاری مدارس کے تعلیم یافتہ ایسے بد عقیدہ نہیں جیسے اس مدرسے کے اکثر تعلیم یافتہ ہیں، اگر نماز و وعظ کے انتظام کو آپ عذر پیش کریں تو یہ خوب جان لیں کہ جب تک آپ کے خیالات نہ بدلیں گے آپ کے متبعین کی وہی کیفیت رہے گی۔

ثالثاً: یہ بھی فرض کر لیا جاوے کہ اس مدرسے کی ضرورت ہی ہے، اور اسی مدرسے سے

ترقی دین و دنیا کی ہو سکتی ہے تو اس صورت میں انصاف سے دیکھیے ترقی کے مستحق زیادہ کون لوگ ہیں، اُمرا یا غریبا، امرا کو تو پہلے سے ترقی حاصل ہے، آپ کی مطلوب ترقی نہ سہی، مگر کسی قسم کی تو ہے جو ان کے لیے کافی ہے، ان کے لیے زیادہ اہتمام کرنا تحصیل حاصل کی قبیل سے ہے، البتہ غریبا اس کے زیادہ مستحق تھے، غریب بچوں کو مدرسے میں داخل کیا جاتا، ان کے مصارف کی کفالت کی جاتی، ان کو تعلیم و تربیت کر کے معزز عہدوں پر ممتاز کراتے، ان کے دل سے دعا نکلتی۔ خیر! اگر قبول دعا کوئی چیز نہیں تو ان کے دلوں کو راحت تو پہنچتی، یہ تو آپ کے نزدیک بھی محمود چیز ہے۔ اب تو تحقیق ہوا ہے کہ غریب کا گزر وہاں مشکل ہے، پھر ہمدردی قومی و خیر خواہی مسلمانان کہاں رہی؟

پھر اُمرا نے بڑھ کر ترقی بھی کی تو اول تعلیم میں کس قدر صرف ہوتا ہے، خصوصاً جو لوگ کہ یہاں سے ولایت جاتے ہیں جو آپ کے نزدیک عین صلاح ہے، ان کا اس قدر صرف ہوتا ہے کہ اس رقم کا بڑا گاؤں آسکتا ہے، یا تجارت کر کے اس کا بڑا کارخانہ بن سکتا ہے، جس میں اس شخص کی استعداد کے قریب کے لوگ کارکن مقرر ہو سکتے ہیں، اس سے بھی قطع نظر کرنی جاوے تو مبلغ ترقی یہ ہے کہ بیرسٹر ہو گئے، یا کوئی حکومت مل گئی، اگر بیرسٹر ہیں تو انھوں نے ستانا شروع کیا، جو دو قومی بھائی لڑیں تو ہماری ضرورت رفع ہو، ان کی مراد پوری ہوئی، کسی نے ان کو مقرر کرنا چاہا تو ایک پیشی کے دو چار سو روپیہ علی قدر اپنے کمال کے اس سے فرمایا، اس نے کچھ کم کہا تو خفا ہو کر نکالنے کا حکم دیا۔ صاحب الغرض مجنون اس نے معذرت کر کے وہ رقم قبول کی، اور جہاں سے ہو سکا توڑ جوڑ کر بندوبست کر کے ان کا رومال بھر دیا، خدا کی قدرت! پہلی پیشی میں بحث تمام نہ ہوئی، دوسری تاریخ مقرر ہوئی، اس تاریخ میں بھی وہی رقم مانگی گئی۔ غرض! دو تین پیشیوں میں اس کا، اس کے اعزہ کا گھر لٹ گیا، بھلا! یہ کیا ترقی و ہمدردی ہے کہ دس گھرا جز کر ایک آباد کیا جاوے۔

اگر حکومت مل گئی تو عقائد پہلے سے خراب ہو چکے ہیں، قبر و حشر فسانہ بے معنی ہے، پھر خدا کا خوف کس لیے، تہذیب اخلاق میں یہ قوت ہرگز نہیں کہ امور مذمومہ سے روک سکے، یہ

برکت مذہب ہی میں ہے کہ بعض لوگ اپنے آقا کی ناخوشی سے، کوئی عذابِ قبر و دوزخ سے ڈر کر منہیات سے بچتے ہیں، سو اس شخص کو مذہب مانع رہا نہیں، اخلاق میں یہ قوت نہیں، پھر ایسا شخص جو کچھ کرے، ظلم کرے، رشوت لے، ناحق فیصلہ کرے، پرانی عداوت نکالے، جو کرے تعجب نہیں۔ ایک عاقل نے کیا خوب کہا ہے کہ جو شخص اپنے مذہب کا پابند نہ ہو وہ لائق حکومت کے نہیں، اور اگر کسی کے اخلاق ایسے ہی مہذب ہو گئے ہوں جو سب امور سے مانع ہو جاوے تو یہ شاذ و نادر ہے، و السادر کالمعدوم، بہر حال! جو کاروائی مسلمانوں کی ترقی کے لیے اس وقت ہو رہی ہے وہ سراسر خرابی در خرابی سے بھری ہوئی ہے، پس نہ خیر خواہی اسلام کے اصول صحیح ہیں، نہ خیر خواہی مسلمانان کے ذرائع راست ہیں۔ یہ تو مجملًا ان امور کا ذکر تھا جن کا اثر دوسروں کو پہنچتا ہے۔

اب جو امور آپ کی ذات خاص سے تعلق رکھتے ہیں ان کو بھی بطور نمونہ کے پیش کرتا ہوں، سب سے اول عقائد کی درستی ہے، اگر کچھ شبہات انسان کو واقع ہو جاوےں تعجب نہیں، مگر خدا کے فضل سے اس زمانے میں اہل علم محققین جامع معقول و منقول شبہات رفع کرنے والے موجود ہیں۔ اقل درجہ مولانا محمد علی صاحب تحصیل دار مرحوم کی تحریرات میرے نزدیک آپ کے اصولی و فروعی شبہات کے جواب کے لیے کافی ہیں۔ اصرار کو کام نہ فرمائیے، نظر انصاف سے اس کو دیکھ کر اپنے خیالات درست فرمالیجیے، اور یہ خیال نہ فرمائیے کہ آپ اپنی مشہور تحقیقات کے کس طرح خلاف کہیں، آپ کی انصاف پسند طبیعت پر اس خیال کا احتمال نہیں۔ آپ نے بہت سی غلطیوں کا اقرار بھی فرمایا ہے مثلاً: حدیثِ فاطمہ میں فجاءت فاطمة وھی جویریة کا فجاءت فاطمة ہی و جویریة لکھا گیا۔ پھر آپ نے نہایت انصاف و خوبی کے ساتھ اس سے رجوع کر کے طبع کر دیا، اگر اب بھی اپنے خیالات کو صحیح کر کے اعلان فرما دیجیے تو آپ کا اعلیٰ درجہ کا کمال ظاہر ہو۔ جمہور اہل اسلام کہ وہ تعداد میں آپ کے مدعیان اتباع سے بہت زیادہ ہیں آپ کے محبت و مخلص بن جاویں، اس وقت ان کو ترقی کی تدبیرات جو بتلاویں وہ قبول کرنے کو دل سے تیار ہوں، اور آخرت میں ثواب ملے اپنے صحتِ عقائد کا

بھی، اور بہت سے لوگوں کے محفوظ رہنے کا، اور بعضوں کے عقائد درست ہو جانے کا بھی، جو غایتِ محبت و اعتماد سے آپ کے رجوع کرنے سے وہ بھی رجوع کر لیں۔

دوسرے: نماز کی پابندی جماعت کے ساتھ ضرور ہے، خود نماز کی پابندی فرض ہے، اور جماعت سنتِ موکدہ، اللہ ورسول کی محبت جو مقتضاً اسلام کا ہے وہ اسی کو مقتضی ہے کہ نہ فرض چھوڑے نہ سنت۔ تیسرے: اصلاحِ لباس میں، میں زیادہ دلائل بیان نہیں کرتا، صرف ایک مختصر سی بات کہتا ہوں کہ مرد اگر عورت کا لباس پہن لے تو کیوں معیوب ہے، اسی وجہ سے ایک مذہب کی ایک قوم دوسرے مذہب کے لوگوں کا لباس وضع اختیار کریں تو کیا بے موقع نہیں؟ چوتھے: حق تعالیٰ نے آپ کو ہر قسم کی استطاعت دی ہے، حجِ بیضِ قرآنی فرض ہے، خدا اور رسول کی محبت کا یہ مقتضاً تھا کہ اگر فرضاً اسلام میں حج کی حاضری فرض و سنت بھی نہ ہوتی تب بھی بہ اقتضائے محبت دربارِ خدا و دربارِ رسول میں ہر استطاعت والے کو حاضر ہونا ضرور تھا، نہ کہ حاضری مکہ کی فرض اور حاضری مدینہ طیبہ کی سنت، پھر کس قدر نازیبا ہے کہ عمر میں ایک بار بھی تشریف نہ لاویں، جس وقت لندن کا سفر کیا تھا ذہابا یا ایابا^۱ اگر عدن سے سیدھے تشریف لے آتے تو کیا مشکل تھا؟ اب ہمت کیجیے، اور سامانِ سفر کر دیجیے۔ اور روزہ و زکاۃ ایک مخفی عبادت ہے، مجھ کو اس کی اطلاع نہیں، خدا کرے آپ پابند ہوں، ورنہ وہ بھی فہرستِ معروضاتِ بالا میں منسلک سمجھے جاویں۔

خلاصہ تمام معروضات کا یہ ہے کہ اب آپ کا اخیر وقت ہے، بجز عقائد و اعمال کے کوئی اس سفرِ آخرت کا ساتھی نہیں، اپنے چند روزہ رفقاً کو رخصت کیجیے، خواہ ظاہراً بھی، خواہ صرف دل سے، اور اس دائمی رفیق کو ساتھ لیجیے، یعنی عقائد و اعمال کی اصلاح فرمائیے، کیوں کہ

﴿إِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ﴾^۱

نسیم جاگو کمر کو باندھو
اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے

آخر میں یہ عرض ہے کہ اس التماس نامے میں اگر کوئی لفظ خلاف مزاج سامی سرزد ہوا ہو، مزاج ناشناسی پر حمل کر کے معذور سمجھیں، تعصب و عناد پر مجھول نہ فرماویں کہ بخدا باعثِ تحریر صرف خیر خواہی و دل سوزی ہے، اور عرض ہذا اگر مقبول خاطرِ عاظر ہو، اور امید ہے کہ ہو تو اس نیاز مند کو مطلع فرما کر مسرور کریں، ورنہ کچھ حاجتِ تحریرِ جواب نہیں، زیادہ نیاز۔ فقط

تمتہ اصلاح الخیال

حامد و مصلیٰ، اس مجموعے کی ترتیب کے بعد عزیز مذکور فی الخطبہ کا اس شخصِ ناصح کے پاس دوسرا خط آیا، اس میں بھی کچھ شبہات تھے، اس کے جواب میں بھی چوں کہ ازالہ ان شبہات کا تھا اس لیے اس مکاتیبہ کو بھی اس میں شامل کر دیا گیا۔

خطِ عزیز

اٹھارہویں شبے کی تقریر: میں مدت سے جناب کے خط کا جواب لکھنے کا ارادہ کرتا ہوں، مگر عدیم الفرستی سے آج تک کامیاب نہیں رہا، بہت مرتبہ ارادہ کیا کہ مختصر عرض کر دوں، لیکن جی چاہتا تھا مفصل لکھنے کو، لیکن جب اس کا موقع نہ ملا تو آخر کار آج بالا اختصار عرض کرنے میں اس وجہ سے جلدی کی کہ مدت گزر جانے سے مبادا یہ خیال پیدا ہو کہ ترکِ خط و کتابت کا باعثِ تحریراتِ سابقہ ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ میں آپ کو پورا اطمینان دلاتا ہوں کہ میں دینِ اسلام پر قائم ہوں۔ اس کو بہترین ادیان سمجھتا ہوں۔

انیسویں شبے کی تقریر: اللہ کی توحید میں مجھ کو کوئی شک نہیں، اور اس کا میں نہایت شدت سے پابند ہوں، اور چوں کہ توحید کی نعمت ہم کو ہمارے پیغمبر نے تعلیم فرمائی، اور آپ کی بدولت یہ نعمتِ عظمیٰ ہم کو میسر آئی، لہذا میں ان کو نبیِ برحق جانتا ہوں۔ رہا یہ کہ وہ اللہ کے معشوق ہیں، اور انھیں کی وجہ سے کائنات پیدا ہوئی، اور اللہ تعالیٰ اور پیغمبر میں صرف ایک میم کا فرق ہے، یہ

میرے عقیدے نہیں ہیں، میرا آپ کا عقیدہ وہی ہے کہ جیسا قرآن میں ہے: ﴿قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ﴾ یہاں تک متعلق ایمان کے ہے جو بھگد اللہ میں اپنا درست پاتا ہوں، اور اس کا سوائے میرے اللہ کے کوئی واقف کار نہیں ہو سکتا۔

بیسویں شبے کی تقریر: آگے وہ چیز لیجیے جس کا نام دین ہے، پانچ وقت کی نماز کا حکم لیجیے کہ اللہ کی کیا کیا مصلحتیں ہیں، ان کو استدلالی طور پر سمجھا ہوا ہوں، اور جانتا ہوں کہ اس سے بہتر طریقہ اپنے خالق کی عبادت اور شکرگزاری کا نہیں ہو سکتا، اور ہر شخص کو اس کا پابند رہنا چاہیے۔

اکیسویں شبے کی تقریر: حج اور زکاۃ میں مجھ کو کوئی خدشہ نہیں، البتہ روزوں میں دو ایک باتیں شبہ کی ہیں، وہ یہ نہیں کہ اس کے فرض ہونے میں کوئی شک ہے، بلکہ رمضان کی تخصیص میں، سو میں کوشش کر رہا ہوں کہ اس کی بابت میرا اطمینان ہو جاوے، میں مخالف راہ کو مستحکم کرنا نہیں چاہتا، بلکہ موافق کو۔

بائیسویں شبے کی تقریر: اب رہ گیا لباس وغیرہ اس کی طرف تو میرا کبھی ایک لمحے کے لیے بھی خیال نہیں جاتا کہ اس کو بھی کچھ ایمان یا دین یا مذہب میں کچھ دخل ہے، جب ہم سچے دل سے عقائد اسلامی رکھتے ہیں، بس دنیا میں ہم کو معزز ہو کر رہنا چاہیے، اور اس کے لیے جو طریقہ مناسب ہو استعمال کرنا چاہیے، بشرطے کہ وہ محل عقائد اسلامیہ نہ ہو، میں انگریزی کپڑے پہننا بہ مقتضائے زمانہ صرف اتنا ہی ضروری سمجھتا ہوں جیسا کہ پیشاب پاخانہ کی حاجت، یعنی آدمی یہ کوشش کرتا ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو پاخانہ سے نکلوں، یہی حال میرا ہے کہ گھرواپس آن کر ایک لمحہ بھی گوارا نہیں ہوتا کہ اس لباس میں رہوں۔

تیسویں شبے کی تقریر: اپنے بچہ کی تعلیم کی بابت جو میرا خیال ہے وہ یہ ہے کہ میں اس کو عربی پڑھاؤں، اور ختم قرآن پر اس کو قادر کر دوں، اس کے بعد علوم دنیوی اس کو سکھاؤں، اگر ان سب باتوں پر بھی آپ کو میری طرف سے کچھ خدشہ ہو تو میں کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ اب

دوسری بات یہ ہے کہ مجھ کو مسلمانوں کی تعلیم پر جو مدارس عربیہ میں دی جاتی ہے سخت اعتراض ہے۔ اگر آپ کو اس کی اصلاح منظور ہو تو اس میں تخریر کا سلسلہ جاری رکھیے، میں اپنی معلومات دنیوی سے آپ کو اس میں مدد دوں گا۔

چوبیسویں شبے کی تقریر: میں سچ کہتا ہوں کہ مسلمان عنقریب ڈوبنے والے ہیں، اور بہت قریب ہے وہ زمانہ کہ مسلمانوں کا دین اور دنیا دونوں غارت ہو جاتا ہے، اور یہ نتیجہ ہوگا اسی بے تکلی تعلیم کا جو اس وقت مسلمانوں کو دی جاتی ہے، میں نے جو کچھ اپنے عقیدے میں تزلزل ظاہر کیا ہے میں اس کو واقعی اچھا سمجھتا ہوں، کیوں کہ یہ تزلزل میری تفتیش کا باعث ہے، اور جس آزادی کے ساتھ میں نے اس کو عرض کر دیا ہے اس طرح کا بیان منافقت سے دور ہے۔

۲۸ جون ۱۹۰۱ عیسوی

جوابِ ناصح

اٹھارہویں شبے کا جواب: مجھ کو توقفِ خط سے قلق ضرور تھا، سو بھگد اللہ تعالیٰ آج وہ رفع ہو گیا۔

بیسویں شبے کا جواب: توحید و رسالت کے متعلق اپنے جو عقائد لکھے ہیں وہ نہایت صحیح ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر قائم رکھیں۔ البتہ رسالت کے متعلق ایک بات تصریح سے رہ گئی، وہ یہ کہ اگر آپ کی رسالت و بعثت کو عام مان لیا ہے تو صحیح ہے، اور اگر صرف عرب کے ساتھ خاص اعتقاد کیا جاتا ہے تو یہ بالکل غلط ہے، اور قرآن حدیث کے خلاف، اور نجات کے لیے یہ اعتقاد خصوصیت کے ساتھ کافی نہیں ہے، باقی اللہ تعالیٰ کا معشوق ماننا اگر معشوق بمعنی محبوب ہو تب تو ضروری بات ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں، قرآن مجید سے جا بجا ثابت ہے کہ اچھوں سے اللہ تعالیٰ کو محبت ہے، پھر آپ تو سب اچھوں سے اچھے ہیں، آپ سے کیوں نہ محبت ہوگی، اور اگر معشوق کے وہی معنی ہیں جو شاعروں کے دماغ میں کپکپے ہوئے ہیں، سو واقعی وہ واجب الاعتقاد کیا بلکہ جائز الاعتقاد بھی نہیں، میم کافر یہ اسلامی عقیدہ نہیں، محض بے تکلی بات ہے، اور کبھی تاویل بعید سے صحیح ہو جاوے اور بات ہے۔ بہر حال! یہ عقیدے سے کچھ تعلق نہیں رکھتا، اور کائنات کا آپ کی وجہ سے پیدا ہونا یہ مضمون فی نفسہ صحیح ہے، مگر چوں کہ وہ روایت قطعی نہیں اس لیے وہ داخل عقائد ضرور یہ نہیں۔

بیسویں شبے کا جواب: اس کے بعد جو دین کو صرف نماز و روزہ و حج و زکوٰۃ میں منحصر کر دیا ہے، اس سے مراد اگر ارکانِ دین ہیں تو صحیح ہے، مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ احکامِ دین صرف یہی ہوں، اور اگر احکامِ دین مراد ہیں تو یہ حصر غلط ہے، دین میں ہزاروں احکام ہیں جو بعض فرض ہیں، بعض واجب، بعض سنت، چنانچہ اہل علم پر پوشیدہ نہیں۔

اس کے بعد جو لکھا ہے کہ:

”نماز کی مصلحتیں میں استدلالی طور پر سمجھے ہوئے ہوں“

یہ بات جھگڑے کی نہیں، مگر استدلالی طور پر فروع کا سمجھنا ہی محلِ خطر ہے۔ یاد رکھنے کی بات ہے کہ مذہب کے اصول ہمیشہ عقلی و استدلالی ہوتے ہیں، اور فروع نقلی و شرعی ہوتے ہیں، اس میں جو مصلحتیں نظر آتی ہیں وہ مرتبہ حکمت میں ہوتی ہیں، درجہ علت میں نہیں ہوتیں کہ ان پر مدار ان احکام کا ہو، ان مصالح کو علت سمجھنے میں ہمیشہ اندیشہ ہے کہ جب کسی وجہ سے رائے میں تبدیل واقع ہو جاوے اصل حکم کا انکار مستبعد نہیں، اور نہ ہم کو فروع کو دلائل عقلیہ سے سمجھنے کی ضرورت ہے، کیوں کہ جب نبوت عقلی دلیل سے ثابت ہوگئی، نبی کے سب احکام من جانب اللہ ہوتے ہیں، اور من جانب اللہ جو امر ہو وہ درست اور بجا ہوتا ہے اس دلیل اجمالی میں کفایت ہے، تفصیلی دلائل کی حاجت نہیں، البتہ اصول کو عقلی نہ کہنے سے محالات لازم آتے ہیں جن کی تفصیل طویل ہے، البتہ فروع میں یہ بات ضروری ہے کہ کسی دلیل عقلی قطعی کے خلاف نہ ہوں، اگر کوئی شخص خلاف ہونا ثابت کر دے گا تو صاحب مذہب کے ذمے اس کا جواب ضروری ہوگا۔

ایکسویں شبے کا جواب: اس کے بعد جو تخصیص رمضان میں شبہ کیا ہے کہ ”میں اطمینان کی کوشش کر رہا ہوں“۔

معلوم نہیں اطمینان شرعی مراد ہے یا عقلی، اگر اطمینان شرعی مراد ہے تو دلائل شرعیہ قطعیت قرآن و حدیث میں اس پر قائم ہیں، پھر بے اطمینانی کے کیا معنی؟ اور اگر اطمینان عقلی مراد ہے تو میں اس کا ضابطہ ابھی بیان کر چکا ہوں کہ فروع کا ثابت بدل دلائل عقلیہ ہونا ضرور نہیں۔

بائیسویں شبے کا جواب: اس کے بعد جو لباس کو مذہب یا دین سے بے تعلق لکھا ہے سو دین سے مراد اگر ارکان دین ہے تو بے شک وہ ارکان دین میں داخل نہیں، مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ احکام سے بھی خارج ہو، اور اگر احکام دین مراد ہے تو اس کو دین سے تعلق نہ ماننا محض غلط ہے۔ حدیث میں صاف صاف الفاظ میں بہت لباسوں کی ممانعت مع وعید کے وارد ہے، پھر احکام ہونا کس کو کہتے ہیں، پھر یہ جو لکھا ہے کہ بہ مقتضائے زمانہ انگریزی لباس پہنتا ہوں،

اگر کسی وقت مقتضائے زمانہ یہ ہو کہ نماز نہ پڑھیں تو کیا نماز کو بھی خیر باد کہنا جائز کہا جاوے گا؟
اگر کسی وقت یہ مقتضائے زمانہ ہو کہ کلمہ نہ پڑھیں تو کلمہ بھی ناجائز ہو جائے گا؟ البتہ ضرورت
شدید کی وجہ سے کبھی تخفیف ہو جاتی ہے، سو جب تک کہ ضرورت شدید کا اثبات نہ ہو جواز کی
گنجائش نہیں۔

تیسویں شبے کا جواب: بچے کی تعلیم کی نسبت جو رائے قرار دی ہے بہت خوب ہے، مگر
اس کے ساتھ اتنی رعایت ضروری ہوگی کہ ان علوم دنیوی کو ذریعہ اکتساب نامشروع کا نہ
بتایا جاوے۔

چوبیسویں شبے کا جواب: اس کے بعد لکھا ہے کہ:

”مسلمانوں کی تعلیم کی اگر اصلاح منظور ہو تو دنیوی معلومات سے مددوں۔“

عزیز تمنا ہے کہ اصلاح ہو۔ مگر قدرت نہ ہونے سے کون ذمہ داری کرے، جب
اصلاح نہیں کر سکتا ہوں تو دریافت کرنا بھی بے فائدہ، البتہ کوئی معقول بات اگر معلوم ہو
جاوے گی تو دوسروں سے کہہ دیا جاوے گا، مگر اصلاح اس کو سمجھوں گا جس میں کسی حکم شرعی کی
مخالفت لازم نہ آوے، ورنہ وہ سراسر فساد ہے۔

اور یہ جو لکھا ہے کہ مسلمان عنقریب ڈوبنے والے ہیں، سو قدیم علوم دینیہ کی بدولت تو
آگے ہی چل کر ڈوبیں گے، مگر علوم دنیویہ کی بدولت تو مدت ہوئی ڈوب چکے۔ جس تعلیم کی
بدولت مدت سے ڈوب چکے ہوں وہ بے تکی ہے، یا جس سے آگے ڈوبے جانے کا دعویٰ ہے،
خواہ صحیح دعویٰ ہو یا غلط، کس کو بے تکی کہنا زیادہ زیبا ہے، تفتیش آزادی کے ساتھ کچھ مضائقہ کی
بات نہیں، مگر حق طلبی اور انصاف شرط ہے۔

تحریراتِ مذکورہ کا نافع و موثر ہونا

بجہ تعالیٰ ان جوابات نے اس عزیز کے قلب میں اچھا اثر کیا، بعد چندے تیسرا خط آیا، جس میں یہ عبارت درج تھی:

سابق میں جو نامہ دربارہ معتقدات صادر ہوا تھا میں اس کو حرف بحرف اپنے عقیدے کے موافق پاتا ہوں۔ الحمد للہ! کوئی بات خدشے کی نہیں۔

عرض مولف (زاد مجرہ)

واقعی جب قلب میں انصاف ہوتا ہے، اور دل سے حق کی طلب ہوتی ہے، حق بات ضرور اثر کرتی ہے۔ دوسرے حضرات عقلا سے بھی اس قسم کے شبہات اتفاقیاً پیش آگئے ہیں۔ امید ہے کہ ان جوابات میں منصفانہ نظر کر کے اپنے قلب کو کدورات و ظلماتِ شبہات سے پاک کر لیں گے۔ والسلام علی من اتبع الهدی

۱۳/۱۹ جمادی الاخریٰ، ۱۳۱۹ھ

۱۳۱۹ھ

۱۹۵۱ء

۱۳۶۲ھ

۱۹۴۳ء

- ۴۳

- ۴۲

۱۳۱۹ھ

۱۹۵۱ء

